تحقیقات سے بھی خاطر خواہ مدد ملی ہے، لیکن اردو زبان کی ابتدا اور بعض دوسرے مختلف فیہ مسائل میں وہ کوئی متعین فیصلہ نہیں کر سکے ہیں، وہ اردو کے ہونہار اہل قلم ہیں اور ان کا ادبی و تحقیقی ذوق بھی اچھا ہے ان سے توقع تھی کہ اس قسم کی بحثوں میں کوئی قطعی اور فیصلہ کن رائے تحریر کریں گے، اگر آیندہ ایڈیشن میں اس کی تلافی کر دی گئی تو کتاب کا وزن محسوس کیا جائے گا۔

(۱) **القادیانیۃ بین الاسلام والاستعمار** از ڈاکٹر محمد حسان خاں، تقطیع خورد و

(۲) **ایران کا اسلامی دستور ایک جائزہ۔** متوسط، کاغذ کتابت وطباعت بہتر،

صفحات ۶۰، ۹۴، قیمت ۶ و ۴ روپیے، پتہ: (۱) مکتبۂ دین و دانش ۱۳ شارع مسجد شکور خاں، بھوپال و (۲) بھوپال بک ہاؤس، بدھواڑہ، بھوپال۔

ڈاکٹر مولوی محمد حسان خاں، مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی بھوپالی کے فرزند ہیں، ان کو دینی غیرت وحمیت اپنے والد بزرگوار سے وراثۃً ملی ہے، یہ دونوں کتابچے اسی کا نتیجہ ہیں، پہلے میں برطانوی استعمار کا قادیانیت کا سرپرست اور پشت پناہ ہونا دلائل سے ثابت کیا گیا ہے، رد قادیانیت پر بہت لکھا گیا ہے، اور ضمناً اس پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے کہ قادیانیت انگریزوں کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھی ہے، زیر نظر رسالہ کا خاص اور اصل موضوع یہی ہے، اس میں وہ اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں جو انگریزوں کی قادیانیت کی سرپرستی و تائید کا باعث ہوئے تھے، دوسرے رسالہ میں جسٹس فیصل مولوی خلیل کا موجودہ ایرانی دستور پر تبصرہ درج ہے، یہ بیروت کے اخبار الامان میں بالاقساط شائع ہوا تھا، تبصرہ نگار نے ایرانی دستور کی جن فروگذاشتوں کی جانب توجہ دلائی ہے، ان میں اکثر باتیں قابل غور ہیں، لیکن بعض محل نظر بھی ہیں، پہلا رسالہ عربی میں ہے، اور دوسرا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے، اس کے شروع میں مترجم نے ایرانی انقلاب کے متعلق جو اچھی توقعات قائم کی ہیں خدا کرے وہ پوری ہوں، یہ دونوں رسالے ہونہار مصنف کی اولین کوشش ہے، اس لیے ان میں جو کمی رہ گئی ہے، وہ انشاء اللہ آیندہ دور ہو جائے گی۔

"ض"

جلد ۱۲۹ ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۸۲ء عدد ۲

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں اس وقت دارالمصنفین کے بین الاقوامی سیمینار کی تیاریاں جاری ہیں جس کا عنوان "اسلام اور مستشرقین" ہے، پاکستان اور عرب ممالک سے برابر خبریں موصول ہورہی ہیں کہ وہاں کے فضلاء اس میں شرکت کے لیے پہونچ رہے ہیں۔

دارالمصنفین اپنے محدود ذرائع کے باوجود اپنے مہمانوں کے خیر مقدم اور خاطر تواضع کے لیے پوری تیاری کر رہا ہے، یہاں اچھے ہوٹل نہیں ہیں، اس لیے ان کے قیام کا انتظام اچھے رہائشی خیموں میں کیا گیا ہے، جن میں ہر قسم کی سہولت اور راحت کا سامان ہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی صدر مجلس عاملہ دارالمصنفین اس وقت حجاز میں ہیں اور وہ ذاتی طور پر وہاں کے فضلاء کو اس سیمینار میں شرکت کے لیے دعوت دے رہے ہیں، جو ظاہر ہے کہ اس سیمینار سے ان کے گہرے لگاؤ کا ثبوت ہے، وہاں سے ان کا ٹیلکس آیا ہے کہ اس میں اہم فضلاء کی شرکت ہوگی اور ان شاء اللہ یہ بین الاقوامی اجتماع کامیاب ہوگا، آمین۔ ہندوستان کے اسکالرز بھی کافی تعداد میں شریک ہورہے ہیں۔

یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر اجتماعی طور پر شاید پہلی بار مذاکرہ ہوگا، امید ہے کہ اس کے ہر پہلو پر مفید اور سیر حاصل مباحث ہوں گے، اس میں شک نہیں کہ بعض مستشرقین نے مفید خدمات

انجام دی ہیں، جو کسی حال میں نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہیں، مگر ان میں زیادہ تر ایسے اہل قلم ہیں، جنھوں نے اپنے ماہرانہ انداز بیان اور مخصوص طرز تحقیقات سے ہماری مذہبی، شرعی، فقہی، تاریخی اور علمی وراثت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کی ایک مثال ڈبلو منٹگمری واٹ ہیں، جنھوں نے "محمدؐ مکہ میں" "محمدؐ مدینہ میں" اور "محمد ایک مدبر کی حیثیت سے" وغیرہ لکھ کر علمی حلقے میں ایک اچھے مستشرق کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کرلی ہے، لیکن ان کی کتابوں کے ماخذوں پر نظر پڑی تو ان کی تمام تحقیقات عیسائی مصنفوں کی کتابوں پر مبنی ہیں، قرآن مجید کے حوالے بھی عیسائیوں ہی کے ترجموں سے دیے گئے ہیں، واقدی ان کا محبوب مصنف ہے، لیکن اس کے لیے ولہاوسن کا ترجمہ سامنے رکھا گیا ہے، ان ماخذوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کو عربی زبان سے اتنی واقفیت نہیں کہ براہ راست عربی کتابوں کو اپنا ماخذ بناسکیں، اس طرح ان کے ماخذ ثانوی درجے کے ہیں۔

وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک مورخ ہیں اور ان کا تجزیہ سراسر مورخانہ ہے، لیکن ان کی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کی گھنی جھاڑیوں میں کبھی تو غیر جانب دار مورخ، کبھی ہمدرد مبصر، کبھی بے درد ناقد، کبھی خالص عیسائی پادری کبھی اپنے انداز بیان میں اپنے ناظرین کو گم کر دینے والے مصنف، کبھی چھاپہ مار اہل قلم بن جاتے ہیں، وہ کبھی اسلام کے بڑے ہمدرد ضرور بن جاتے ہیں لیکن اس ہمدردانہ اسلوب میں کچھ نہ کچھ ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ جس سے کبھی تو یقینیات میں شک پیدا کر دیتے ہیں، کبھی اپنے ناظرین کے ذہن پر بجلی کی سرعت سے حملہ کرکے اس کو مغلوب بلکہ مفلوج کرکے اپنے خیالات کو منوانا چاہتے ہیں،

ان کی تحقیقات ان کے موثر لیکن گمراہ کن طرز تحریر میں اس طرح دب کر رہ گئی ہیں کہ ان کے ناظرین ان کی قلمی سحر طرازیوں کے طلسم کی نیرنگیوں سے ایسے مسحور ہو جاتے ہیں کہ ان کی تحقیقات پر نظر نہیں جاتی۔

وہ بظاہر بڑی فراخ دلی سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ تاریخ کی بڑی شخصیتوں میں مغرب میں کسی اور کا اتنا ہلکا یعنی برا جائزہ نہیں لیا گیا جتنا کہ محمدؐ کا لیا گیا ہے، اور جو بھی قابل اعتراض بات آپ کے متعلق کہی گئی وہ ایک حقیقت کی حیثیت سے مان لی گئی ہے، وہ اپنی تحریروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی عظمت پر زور دیتے ہیں، اور یورپین مصنفین آپ پر جو الزامات عائد کرتے ہیں' ان کی تردید بھی جابجا کرتے ہیں، اس سے اپنی غیر جانبداری کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن جب وہ آپ کی ازواج مطہراتؓ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی تعداد تیئیس ۲۳ بتاتے ہیں، اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس میں وہ بھی شامل ہیں جن سے آپ شادی کرنا چاہتے تھے، لیکن نہ ہو سکی' وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مکہ کے لوگوں کو آپ نے مشتعل کیا، تب ہی وہ آپ سے جنگ پر آمادہ ہو گئے اور آپ سے جتنی لڑائیاں لڑی گئیں ان میں جہاد کا جذبہ نہ تھا، بلکہ مکہ کے تجارتی قافلہ کی محض ناکہ بندی تھی، اور یہ ساری معرکہ آرائیاں تجارت میں برتری حاصل کرنے کے لیے ہوئیں وغیرہ وغیرہ۔

وہ اپنے اس دکھ کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ محمدؐ کو ایک آئیڈیل انسان ثابت کرنے کے لیے عیسائی یورپ میں کچھ بھی نہیں کیا گیا ہے، اور وہ بظاہر آپ کو ایک آئیڈیل

انسان سمجھتے ہیں، لیکن اس مداحی اور غیر جانبداری کے پردہ میں قرآن مجید سے اپنے ناظرین کو ہر طرح بدظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کے متعلق یہ لکھ کر شک پیدا کر دیا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ خواب تھا، یا محض ایک رویت یا سچی رویت تھی، یا فصاحت کا ایک ذہنی اور بیرونی انداز بیان، یا آپ نے اس کو کان سے سنا یا خیال کیا کہ وہ سن رہے ہیں، اور جو کچھ وحی کے ذریعہ آیا، وہ الفاظ کی شکل میں آیا یا الفاظ کے بغیر آیا، یا جو الفاظ ہیں وہ بعد کے ہیں یا اصلی ہیں، یا یہ ان کی شخصیت کا ایک حصہ ہے، یا ان کے ذہن کا نتیجہ ہے' وہ یہ لکھ کر بھی شک پیدا کر دیتے ہیں کہ لفظ وحی کا استعمال بعد میں کیا گیا، ایک جگہ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اسلام کے مخالفین کہتے ہیں کہ محمدؐ کو مرگی آتی تھی، اس لیے ان کے مذہبی الہامات مستند نہیں، وہ وحی و الہام کے متعلق یہ بحث بھی چھیڑ کر دلوں میں یہ شک پیدا کر دیتے ہیں کہ یہ الہامات ہیں یا محض تکوینی خیالات ہیں، پھر ناظرین کو اپنے سے بدظن نہ ہونے کی خاطر یہ لکھتے ہیں کہ کلام پاک میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں وہ بڑی حد تک سچے اور بالکل صحیح ہیں، لیکن اپنی تصنیفی مہارت سے کام لے کر فوراً یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ اس کے سارے خیالات سچ اور بالکل صحیح ہوں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بظاہر مداح ہونے کے باوجود یہ بھی لکھتے ہیں کہ آپ نے جتنے خیالات کی ترویج کی وہ سب کے سب سچے اور صحیح نہیں ہیں۔

منٹگمری واٹ ہی کی طرح اور مستشرقین اپنے مجادلانہ استدلالوں، گمراہ کن

منطقیانہ مغالطوں، پھر تحریفات، تلبیسات، دور ازکار قیاسات اور احتمالات سے مغلوطات کا سلسلہ پیدا کر کے اسلام کے خلاف زہر چکانی کر رہے ہیں، وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی کچھ خوبیاں اس لیے بیان کرتے ہیں کہ ان کی آڑ میں ان کے متعلق وہ بہت کچھ سخت سی بات اور برائی بیان کرنا چاہتے ہیں، ان کے اس پُرفریب انداز بیان سے ہوشیار رہنے اور ان کی اصل نیت کو آشکارا کرنے کی ضرورت ہے۔

ان سطروں کے لکھتے وقت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے عزیز بھانجے جناب محمد ثانی حسنی کی وفات حسرت آیات کی اندوہناک خبر ملی، ان کو مولانا علی میاں اپنے فرزند کے برابر سمجھتے رہے، وہ اپنی متانت، سنجیدگی اور خاموشی کی وجہ سے اپنے حلقہ میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، بڑے اچھے اہل قلم بھی تھے، ان کی کتابوں میں ایمانی حرارت و حمیت جلوہ گر رہتی تھی، ان کی وفات سے دارالمصنفین بھی سوگوار ہے، اس لیے بھی کہ یہاں جو سیمنار ہو رہا ہے اس کے روح رواں مولانا علی میاں اور ان کے دست و بازو مولانا محمد رابع ندوی تھے، جو مرحوم کے منجھلے بھائی تھے، ان کی سوگواری سے ہمارے سیمنار کی فضا بھی غمناک رہے گی، دعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نعیم اور ان کے سوگوار ماموں، بھائیوں اور بچوں کو صبر جمیل عطا ہو۔

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۶)

تابعین ۱۹۳۷ء | یہ خاکسار دارالمصنفین جنوری ۱۹۳۵ء میں پہونچا تھا، اس وقت تک صحابۂ کرامؓ کے سلسلہ کی تدوین ختم ہو چکی تھی، ۱۹۳۴ء میں شاہ صاحبؒ کی "عرب کی موجودہ حکومتیں" چھپ کر شایع ہو چکی تھی، ۱۹۳۵ء کے ستمبر یا اکتوبر کے مہینے میں ایک دن شام کی چائے پر سید صاحبؒ نے شاہ صاحبؒ سے کہا کہ صحابۂ کرامؓ کے بعد تابعین پر بھی کم از کم ایک جلد ہونی چاہیے اور پھر انہی کو یہ جلد لکھنے کو کہا، دسمبر ۱۹۳۵ء میں سید صاحبؒ سخت علیل ہو گئے، جب ان کو کامل صحت ہوئی تو ۱۹۳۶ء کے اواخر میں ایک دن شاہ صاحبؒ سے شام کی چائے پر پوچھا کہ تابعین پر آپ نے کچھ لکھنا شروع کیا یا نہیں؟ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب شاہ صاحبؒ نے جواب دیا کہ وہ تو ختم بھی ہو گئی، خود سید صاحبؒ کو بھی تعجب ہوا، یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں چھپی تو اس کی ضخامت پانسو پچپن ۵۵۹ صفحے تھی، ان کے قلم کی اس برق وشی پر رفقائے دارالمصنفین بھی متحیر اور خوش تھے، اس کے شروع میں جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی صدر نشین دارالمصنفین کا مقدمہ ہے، جس میں وہ رقمطراز ہیں:

"دارالمصنفین کو جزائے خیر ہو کہ اس سے پہلے سیرۃ مبارک اور صحابۂ کرامؓ کے حالات میں متعدد جلدیں شایع کر چکا ہے، اب نوبت حالات تابعین کی ہے، اسی سلسلہ میں رفیق دارالمصنفین مولوی معین الدین احمد صاحب نے

یہ جلد تالیف کرکے مسلمانوں پر خصوصاً اور سارے انسانوں پر عموماً لطف وکرم فرمایا ہے، جزاہ اللہ تعالیٰ خیراً۔

اس کتاب کو پڑھ کر اور مختلف مقامات کو بار بار دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ حق محنت وسعی ادا کیا گیا ہے، مستند اور معتمد ماخذوں سے حالات لے کر صاف و دل نشین پیرایہ میں قلمبند کیے ہیں، ۹۶ اکابر تابعین کے حالات ہیں، ظاہر ہے کہ کل کے مقابلہ میں یہ ایک جزء ہے، تاہم جزءِ اعظم ہے، میرا خیال ہے کہ ایک جلد اور شایع ہوگی جس میں بقیہ اکابر کے حالات ہوں گے۔"

اس کتاب کی ایک فروگذاشت کی طرف بھی نواب صاحب مرحوم نے یہ لکھ کر توجہ دلائی کہ اکابر تابعین رضؓ کے ناموں کے ساتھ مقررہ اسلوب کے مطابق امام وغیرہ الفاظ کا عدم استعمال اسلوب ادب کے خلاف محسوس ہوتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے حاشیہ میں یہ اعتذار لکھا کہ حضرت مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے، لفظ امام وغیرہ اگرچہ میں نے کتاب میں جا بجا لکھا ہے، مگر اس کا ترک بھی ہوا ہے، اس عدم التزام کے سبب میں ان بزرگوں کی روحوں سے شرمندہ ہوں، ان شاء اللہ طبع ثانی میں اس کا پورا لحاظ رہے گا۔

شاہ صاحبؒ نے بھی کتاب کے شروع میں ایک پُرمغز دیباچہ لکھا ہے جس سے تابعین کرامؓ کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ ان کے خیال میں ایمانی قوت، دینی حمیت، مذہبی و اخلاقی روح اور علمی و عملی خدمت کے اعتبار سے اسلام کے تین زریں دور گذرے ہیں، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین، ان ہی تین زمانوں میں مسلمان دینی اور دنیوی سعادت و فلاح کی معراجِ کمال کو پہونچے، اس کے بعد جو ترقیاں ہوئیں، وہ صرف ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں، تابعین کرامؓ کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اگر صحابۂ کرامؓ دین کے اصلی سرچشمے تھے تو تبع تابعین میں بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے، تابعین درمیانی کڑی ہیں، انھوں نے صحابۂ کرام کی علمی و اخلاقی برکتوں کو زندہ رکھ کر سارے عالم میں پھیلایا، پھر تبع تابعین میں جتنے بڑے ائمہ

گذرے، سب ان ہی کے حلقۂ درس کے فیض یافتہ تھے، شاہ صاحبؒ تابعینِ کرام کے سوانح حالات لکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہونچے تھے، اس کو اس طرح قلمبند کرتے ہیں:

"یہ مقدس جماعت علم و عمل میں صحابۂ رسول صلعم کا عکس اور پرتو تھی، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور صحابہ کی علمی و اخلاقی وراثت کو مسلمانوں میں پھیلایا، عہد رسالت کے بعد اور شخصی حکومت کے اثر سے اسلامی نظام میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کی اصلاح کی، اور اگر اصلاح نہ کر سکی تو ان خرابیوں کے مقابلہ میں اسلام کے مصفا سرچشمہ کو باہر کے گرد و غبار اور کدورت سے اپنی کوششوں سے محفوظ رکھا، مذہبی علوم کی حفاظت و اشاعت کے لیے نئے علوم کی بنیاد رکھی، اسلامی سلطنت کے حدود کو وسیع کیا، اسلام کو پھیلایا، غرض ان تمام برکتوں کو جن کا عہد صحابہ میں آغاز ہوا تھا، تکمیل تک پہونچایا، اور جو پوری ہو چکی تھیں، ان کی حفاظت کی۔"

اس کتاب میں تمام تابعین کے حالات نہ آسکے، اس لیے صرف چھیانوے ۹۶ اکابر تابعین کا ذکر ہے، اس کی تیاری میں حسب ذیل ماخذوں سے مدد لی گئی ہے:

تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب، طبقات ابن سعد، طبقات کبریٰ شعرانی، تہذیب الاسماء، تاریخ ابن خلکان، تذکرۂ ابراہیم نخعی، شذرات الذہب، استیعاب، اسد الغابۃ، ابن اثیر، اخبار الطوال، تاریخ ابن عساکر، تاریخ خطیب، مسلم کتاب الفضائل، مستدرک حاکم، اصابہ، انتباہ فی سلسلۃ اولیاء اللہ شاہ ولی اللہؒ، تذکرۃ الاولیاء فرید الدین، صفوۃ الصفوۃ، الطرق الحکمیہ ابن قیم جوزی، تہذیب الاسماء، کشف المحجوب، کتاب اللمع، عوارف المعارف، کتاب العمدۃ ابن رشیق، کتاب الولاۃ کندی، حسن المحاضرۃ سیوطی، سیرۃ عمر بن عبد العزیز ابن جوزی، تاریخ یعقوبی، خلاصۃ الوفاء، فتح الباری، تاریخ الخلفاء، کتاب الخراج، زرقانی، شرح موطا، نصب الرایہ، فتوح البلدان، العیون والحدائق، بخاری کتاب الایمان، جامع بیان العلم، خطط مقریزی، بخاری کتاب العلم،

کتاب البیان والتبیین، اعلام الموقعین، مروج الذہب مسعودی، دول الاسلام وغیرہ۔

ان بزرگانِ دین کے حالات حروفِ تہجی کے لحاظ سے لکھے گئے ہیں، آخر میں کچھ کے سوانح کنیت کے مطابق ہیں۔

اسلام کی تاریخ میں زیادہ تر جنگ و جدل کے واقعات لکھے جاتے ہیں، لیکن ان تابعین کرام نے کلام پاک، حدیث، تفسیر اور فقہ کی خدمات کن کن طریقوں سے کی، پھر انھوں نے زہد، عبادت، ورع، خشیتِ الٰہی، ریاضت، صحتِ عقیدہ، عبادت کے اخفاء، بارگاہ ایزدی میں الحاح، توبہ، استغفار، تواضع، خاکساری، نفس و کمالِ حق گوئی، طہارت، کسبِ حلال، استغناء، بے نیازی، فیاضی، شہرت سے اجتناب، ماں کی خدمت، مبتدعانہ عقائد سے نفرت، تحدیث نعمت، ازدواج، اخلاص فی العمل، فریبِ نفس، توبہ کی سپر، موت کے ذوق، شب بیداری، جہاد لوجہ اللہ، انفاق فی سبیل اللہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، پندار تقویٰ سے پرہیز، شدت احتیاط، اختلافِ رائے کے ساتھ اتحادِ عمل، وقار، ہیبت، خونِ مسلم کی حرمت، ظلم و زیادتی کے کوڑوں کے مقابلہ میں اعلانِ حق، ایثار، ہمدردی، غربت پسندی، خانۂ خدا کا احترام، فرمانِ رسولؐ کا پاس، اہل دنیا سے بے تعلقی، احسان میں اخفاء، صبر، استقامت، علم و تثبیت، قوتِ ایمانی، اکل حلال، حلم، بردباری، عفو و درگذر، نرمی، ملاطفت، محبوبیت و جلالت، نفاست، آیاتِ قرآنی سے تاثر، دنیا سے بے تعلقی وغیرہ کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا، اس کا مطالعہ اس کتاب میں کر کے درس لیا جا سکتا ہے، یہ کتاب تو اس لائق ہے کہ ہر گھر میں موجود رہے اور ان بزرگوں نے اپنی زندگی میں اخلاق کے مذکورۂ بالا محاسن کو جس طرح اختیار کر کے دکھایا، اگر مسلمان اس اسوہ کو برابر سامنے رکھیں اور اس پر عمل کریں تو وہ تمام انسانوں کے لیے رحمت بن سکتے ہیں، اس کتاب کے مقدمہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنی جو یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مولوی معین الدین ندوی صاحب نے یہ جلد تالیف کر کے مسلمانوں پر خصوصاً اور سارے انسانوں پر عموماً لطف و کرم فرمایا ہے، تو بالکل صحیح لکھا ہے۔

اس کتاب میں جتنے تابعین کا ذکر ہے ان میں سے یوں تو ہر ایک کے حالات سے کچھ نہ کچھ سیکھا جا سکتا ہے،

مگر حضرت حسن بصریؒ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، خیر التابعین حضرت اویس بن عامر قرنیؒ کے حالات شاہ صاحبؒ کے انداز بیان کی وجہ سے بہت اہم ہو گئے ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ کے والدین غلام تھے، مگر وہ ایسے جامعِ کمالات تھے کہ وہ بلند مرتبت عالم بھی ہوئے، رفیع المنزلت فقیہ بھی، وسیع العلم عابد و زاہد بھی، تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں سے مالا مال تھے، اس عہد کے تمام علماء اور اربابِ کمال کا ان کی جلالتِ شان پر اتفاق تھا، عراق میں وہ سب سے افضل سمجھے جاتے تھے، جہاں وہ جاتے خلق اللہ کا مرجع بن جاتے، مکہ تک میں جو مدینہ کے بعد علم کا دوسرا مرکز تھا، لوگوں کا ہجوم لگ جاتا تھا، اہل مکہ آپ کو تخت پر بٹھا کر حدیثیں سنتے تھے، اور اکابر علم کی زبان پر یہ کلمہ ہوتا، کہ ہم نے اس شخص کا مثل نہیں دیکھا، وہ عرفان و حقیقت کے کنگرہ بھی تھے، اس لیے ان کی ذات تصوف کا منبع اور علم باطن کا سرچشمہ بن گئی، تصوف کے اکثر بڑے بڑے سلاسل ان ہی کے واسطے سے حضرت علیؓ تک منتہی ہوتے ہیں، اور تمام صوفیائے کرام ان ہی کی زندگی سے زہد و ورع، فضائل اخلاق، سوز و گداز، خشیتِ الٰہی، اخلاص فی العمل، فریبِ نفس کے خوف اور اظہار حق کا درس لیتے ہیں، ان کے ان اوصاف کو شاہ صاحبؒ نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کے انداز بیان کا ایک نمونہ یہ ہے:

"خشیتِ الٰہی کا اس قدر غلبہ تھا کہ ہر آن لرزاں رہتے تھے، یونس بن عبیدؒ کا بیان ہے کہ جب حسنؒ آتے تھے، تو معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی عزیز قریب کو دفن کیے ہوئے آرہے ہیں، جب بیٹھتے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسے قیدی ہیں جس کی گردن مارے جانے کا حکم دیا جا چکا ہے، اور جب دوزخ کا ذکر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوزخ صرف ان ہی کے لیے بنائی گئی ہے، اس پُر سوز، بلکہ پُر کیف فطرت کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کی زندگی سرتاپا زہد و ورع میں ڈوبی ہوئی تھی، ان کی ذات عبادت و ریاضت اور زہد و ورع کا مجموعہ تھی، حجاج الاسود کا بیان ہے کہ ایک شخص آرزو کیا کرتا تھا کہ کاش مجھے حسنؒ کا زہد، ابن سیرینؒ کا ورع، عامر بن عبد قیسؒ کی عبادت اور سعید بن مسیبؒ کا تفقہ میسر آئے، لوگوں نے دیکھا تو

فرمایا کرتے تھے، خدایا! میں تجھ سے بھوکے جگر اور ننگے بدن کی معذرت چاہتا ہوں، لباس جو میرے
جسم پر اور غذا جو میرے پیٹ میں ہے' اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" (ص ۴۲)

ان چند سطروں میں کیسی موثر مرقع آرائی ہے، جس میں تحریر کے اسلوب کو بھی بڑا دخل ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ تابعین میں تھے، مگر وہ بنو امیہ کے سلسلہ کے خلیفہ بھی ہوئے تو انھوں نے
خلافت راشدہ کی یاد تازہ کردی، ان کی سیرت کی مصوری بہت سے اہل قلم نے کی ہے اور شاہ صاحبؒ
کے قلم سے بھی اس سیرت نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"سلاطین کی بزم طرب میں موت اور قیامت کا ذکر اور خوف کا گذر بھی نہیں ہوتا، لیکن عمر بن عبدالعزیزؓ
کی مجلس بزم عزا ہوتی تھی، رات کو علماء جمع ہوکر موت اور قیامت کا ذکر کرکے اس طرح روتے تھے جیسے
ان کے سامنے جنازہ رکھا ہے، رات رات بھر جاگ کر موت پر غور و فکر کیا کرتے تھے' اور قبر کی ہولناکیوں
کا ذکر کرکے بیہوش ہوجاتے تھے، ایک مرتبہ اپنے ایک ہم جلیس سے فرمایا: میں رات بھر غور و فکر
میں جاگتا رہا، اس نے پوچھا: کس چیز کے متعلق؟ فرمایا: قبر اور اہل قبر کے متعلق، اگر تم مردے کو تین
دن کے بعد قبر میں دیکھو تو انس و محبت کے باوجود اس کے پاس جاتے ہوئے خوف زدہ ہوگے، تم ایسا
گھر دیکھوگے جس میں خوش وضعی، خوش لباسی اور خوشبو کے بعد کیڑے رینگ رہے ہوں گے، پیپ
بہ رہی ہوگی اور اس میں کیڑے تیر رہے ہوں گے، بدبو پھیلی ہوگی، کفن بوسیدہ ہوچکا ہوگا، یہ کہہ کر
ہچکی بندھ گئی، پھر بیہوش ہوکر گر پڑے، ان کی بیوی پانی چھڑک کر ہوش میں لائیں۔" (ص ۳۵۲ / ۱۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لیکن شاہ صاحبؒ نے اپنی اس کتاب میں
ان کے رموز جہانبانی کے سلسلہ میں غصب کردہ مال و جائداد کی واپسی، ظالم عہدہ داروں کے تدارک،
مظالم کے انسداد، بیت المال کی آمدنی کی اصلاح، اس کی حفاظت کا انتظام، ذمیوں کے حقوق، رعایا
کی خوشحالی، مذہبی خدمات، رفاہ عام کے کام، بادشاہت کے امتیازات کے استیصال، ذمہ داری کا

یہ تمام اوصاف حسنؒ کی تنہا ذات میں جمع تھے، ان کی مجلس میں آخرت کے علاوہ کسی شے کا تذکرہ ہی
نہ ہوتا تھا، اشعث کا بیان ہے کہ ہم جب حسنؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ہم سے نہ دنیاوی خبر
پوچھی جاتی اور نہ کوئی خبر دی جاتی، بس صرف آخرت کا ذکر رہتا تھا۔" (ص ۸۵)

حضرت اویس قرنیؒ کے صحیفۂ قلب سے بھی علوم باطن سیکھے گئے ہیں، کیونکہ تابعین میں حضرت
خواجہ حسن بصریؒ کے بعد ہی ان کی ذات گرامی بھی تصوف کا مرجع ہے، صوفیائے کرام کے بہت سے
سلاسل ان کی ذات تک بھی منتہی ہوتے ہیں، انھوں نے راہِ سلوک میں بڑے بڑے مجاہدات کیے،
ساری ساری رات پلک سے پلک نہ لگتی تھی، ربیع بن خیثم کا بیان ہے کہ ایک دن وہ ان سے ملنے گئے
تو دیکھا کہ وہ فجر کی نماز میں مشغول ہیں، ظہر کی نماز تک اسی طرح مشغول رہے، پھر ظہر سے عصر تک اور عصر سے
مغرب تک یہی حال رہا، پھر مغرب سے عشاء تک مشغول رہے، عشاء سے صبح تک یہی کیفیت رہی،
دوسرے دن نمازِ فجر کے بعد کچھ نیند کا غلبہ ہوا، فوراً متنبہ ہوگئے، اور دعا کی کہ خدایا! میں سونے والی
آنکھ اور نہ بھرنے والے پیٹ سے پناہ مانگتا ہوں، شاہ صاحبؒ نے ان کی زندگی کے پُرکیف واقعات
بڑی خوش سلیقگی سے دکھائے ہیں، ان کے متعلق جو یہ خیال ہو کہ ان کا وجود ہی نہ تھا، اس کی تردید شاہ
صاحبؒ نے پورے دلائل کے ساتھ کی ہے، ان کے کردار کی تصویر شاہ صاحبؒ نے اپنے قلم سے
یہ پیش کی ہے:

"زہد کا یہ عالم تھا کہ گھربار، لباس اور کھانے پینے وغیرہ جملہ علائق دنیاوی سے ہمیشہ آزاد رہے،
ایک نہایت بوسیدہ اور شکستہ مکان میں رہتے تھے، کھانے پینے کا یہ حال تھا کہ کبھی اونٹ چرا کر،
اور کبھی کھجور کی گٹھلیاں بیچ کر قوت لایموت حاصل کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے سلوک کرنا چاہا مگر انکار کر دیا،
لباس میں ایک صوف کی چادر اور ایک صوف کا ازار ہوتا تھا اور اکثر وہ بھی میسر نہ آتا تھا، لوگ ننگے بدن
دیکھ کر چادر دے دیتے، پیٹ کے کھانے اور بدن کے کپڑے کے علاوہ کوئی چیز پاس نہ رکھتے تھے،

احساس، خشیت الٰہی، موت اور قیامت کے خوف وغیرہ کے سلسلہ میں جو کچھ مختصر طریقہ پر لکھ دیا ہے اس سے بہتر شاید ہی کوئی اور مورخ لکھ سکے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر نے شاہ صاحبؒ کی تحریر کی خوبی کی تعریف جو یہ لکھ کر کی ہے کہ اس کتاب میں تمام حالات صاف و دلنشین پیرایے میں قلمبند کیے گئے ہیں، وہ شروع سے آخر تک قائم ہے، جو ان کی قوت تحریر کی بڑی دلیل ہے۔

شاہ صاحبؒ نے ان تابعین کرام کے اقوال بھی بڑی محنت سے جمع کر دیے ہیں، جن کو پڑھ کر ایمانی قوت، دینی حمیت اور اخلاقی روح کا بیدار ہو جانا ناگزیر ہے، ان اقوال میں سے کچھ ہم بیان کر کے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

حضرت اویس قرنیؒ | لوگوں کے لیے غائبانہ دعا کرنا ان کی ملاقات سے بہتر ہے، کیونکہ اس میں کبھی نمائش اور ریا پیدا ہو جاتی ہے۔

جعفر بن محمد الملقب بہ صادقؒ | جو شخص اپنی قسمت کے حصہ پر قناعت کرتا ہے، وہ مستغنی رہتا ہے، اور جو دوسرے کے مال کی طرف نظر اٹھاتا ہے، وہ فقیر مرتا ہے۔

تم سے کوئی گناہ سرزد ہو تو اس کی مغفرت چاہو، انسان کی تخلیق سے پہلے سے اس کی گردن میں خطاؤں کا طوق پڑا ہے۔

گناہوں پر اصرار ہلاکت ہے۔

خدا نے دنیا کی طرف وحی کی ہے کہ جو شخص میری خدمت کرتا ہے تو تو اس کی خدمت کر اور جو تیری خدمت کرتا ہے اسے تھکا دے۔

جب تمہارے بھائی کی جانب سے تمہارے لیے کوئی ناپسندیدہ بات ظاہر ہو تو اس کے جواز کے لیے ایک سے ستر تک تاویلیں تلاش کرو، اور اگر پھر بھی نہ ملے تو سمجھو کہ اس کا سبب اور اس کی کوئی

تاویل ضرور ہوگی، جس کا تم کو علم نہیں، اگر تم کسی مسلمان سے کوئی کلمہ سنو تو اس کو بہتر سے بہتر معنی پر محمول کرو، جب وہ محمول نہ ہو سکے، تو اپنے نفس کو ملامت کرو۔

جب دنیا کسی کے موافق ہوتی ہے تو دوسروں کی بھلائیاں بھی اسے دے دیتی ہے اور جب منھ پھیر لیتی ہے تو خود اس کی خوبیاں بھی چھین لیتی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ | متواضع ہونے کی شرط یہ ہے کہ گھر سے باہر کسی سے بھی ملے تو اس کو اپنے سے افضل اور برتر سمجھے۔

ایک شخص کی عداوت کے بدلہ میں ہزار آدمیوں کی دوستی بھی نہ خریدو۔

انسان کا علانیہ اپنے نفس کی مذمت کرنا درحقیقت اس کی مدح ہے۔

فقیہ وہ ہے جو دنیا سے کنارہ کش ہو، ذہن میں بصیرت رکھتا ہو، خدائے عز و جل کی عبادت پر مداومت کرتا ہو۔

دنیا درحقیقت تمہاری سواری ہے، اگر تم اس پر سوار ہو گئے تو وہ تم کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے گی، اگر وہ تم پر سوار ہو گئی تو تم کو ہلاک کر ڈالے گی۔

میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس نے دنیا چاہی ہو اور اسے آخرت ملی ہو، اس کے برخلاف جو آخرت چاہتا ہے اسے دنیا بھی مل جاتی ہے۔

سعید بن جبیرؒ | وہ امت مسلمہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ علمائے سوء کو سمجھتے تھے، ہلال بن خباب نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ لوگوں کی ہلاکت کہاں سے ہوگی، فرمایا: ان کے علماء کے ہاتھوں الخ الخ الخ،

تاریخ اسلام کی تدوین | جب سید صاحب کی نگرانی میں صحابۂ کرام کے سلسلہ کی ترتیب ہو رہی تھی، تو اسلامی ممالک کی تاریخ کی تدوین بھی جاری تھی، مولوی ریاست علی ندوی صاحب تاریخ صقلیہ پورے انہماک اور محنت سے لکھ رہے تھے، جناب محمد عزیز صاحب دولت عثمانیہ لکھنے میں مشغول تھے، عہد رسالت و خلافت راشدہ

بنو امیہ اور بنو عباس کی تاریخ معرضِ التواء میں تھی، شاہ صاحب سیر الصحابہ جلد ہفتم اور عرب کی موجودہ حکومتیں لکھ چکے تو سید صاحب نے انہی کو ان تمام ادوار کی تاریخ لکھنے کے لیے منتخب کیا، جو بہت ہی موزوں ثابت ہوا، وہ فرنگی محل اور ندوہ کی تعلیم کے زمانہ میں اسلام، اسلامی روایات اور اسلامی تاریخ کی روح سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، جب وہ فرنگی محل میں تعلیم پا رہے تھے، تو ہندوستان میں خلافت کی تحریک کا آغاز ہوا، جس کے حامیوں اور جان نثاروں میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی بھی تھے، شاہ صاحب نے ان کی نگرانی میں تربیت پائی تھی، اس لیے خلافت کی پوری تاریخ کا غلغلہ ان کے کانوں میں پڑا، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء آئے تو سید صاحب کی 'خلافت اور ہندوستان' اور 'خلافت' ان کی نظر سے گذری، جن کے مطالعہ سے ان کے دل پر خلافت کی اہمیت کا گہرا نقش پڑا، دار المصنفین آئے تو سیر المہاجرین اور سیر الصحابہؓ کی جلدیں لکھنے میں حدیث، رجال، طبقات، تاریخ اور سیر وغیرہ کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا، سیر الصحابہؓ جلد ششم لکھنے میں خلافتِ راشدہ کے عہد یا اس کے بعد کی تاریخ میں جو نشیب و فراز آیا، اس سے پورے طور پر واقف ہوئے، اسی زمانہ میں سیرۃ النبیؐ کی مختلف جلدوں کی تدوین ہو رہی تھی، ان کو اس کے موضوعات سے پوری آگاہی ہوئی، پھر سید صاحبؒ کی صحبت کی علمی گفتگوؤں سے ان کے ذہن کی پوری جلا ہوتی گئی، ۱۹۳۴ء میں عرب کی موجودہ حکومتیں لکھی تو جزیرۃ العرب کے ساتھ عسیر، بحرین، نجد، کویت، شام اور عراق کے جغرافیائی حدود سے اچھی طرح واقف ہو گئے، پھر ان علاقوں کی جو مختصر تاریخ لکھی تو وہاں کے لوگوں کے مزاج اور ان کے مذہبی پس منظر کا پورا نقشہ ان کے سامنے آگیا، اس لیے تاریخ اسلام کے لکھنے میں جتنی تیاریوں کی ضرورت تھی، وہ سب کچھ ان کے ذریعہ سے ان کو حاصل ہو چکی تھی،

عہد رسالت و خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس کی تاریخ بہت ہی الجھی اور پھیلی ہوئی ہے، ان تمام تفصیلات کو سمیٹ کر اور سلجھا کر لکھنے کے لیے قلم میں بڑی سلامت روی اور اعتدال پسندی کی ضرورت تھی، جو شاہ صاحب کو فطری طور پر ودیعت ہوئی تھی، پھر ان خاندانوں کی تاریخ میں ایسا زمانہ بھی آیا جس کو

مسلمانوں کے انتہائی عروج کا عہد بھی کہا جا سکتا ہے، ان میں باہمی نفاق، افتراق، رقابت اور خانہ جنگی ضرور رہی، لیکن ان تاریک پہلوؤں کے ساتھ ان کا کچھ زمانہ سیاسی، معاشرتی، تمدنی، تہذیبی اور علمی حیثیت سے طراز زریں دور بھی رہا، مسلمانوں کے اہم ترین علمی کارنامے عباسی عہد ہی کی یادگار ہیں، اسی دور میں ایرانی، کلدانی، مصری، رومی، یونانی اور ہندی تہذیب و تمدن کے گوناگوں رنگوں سے عربی تمدن میں وہ نقش آرائیاں ہوئیں کہ اسی کا نام اسلامی تمدن قرار پایا،

ان سارے کوائف کو سمیٹنے کے لیے ایک شگفتہ، رواں، پختہ اور طاقت ور قلم کی ضرورت تھی، یہ شرط بھی شاہ صاحبؒ سے پوری ہوتی تھی، معارف کی مضمون نگاری اور کئی کتابوں کے مصنف ہو جانے کی بدولت ان کے قلم میں شگفتگی اور روانی کے ساتھ بڑی توانائی اور پختگی بھی آگئی تھی، مولانا شبلیؒ نے الفاروق اور المامون میں تاریخی واقعات کے لکھنے میں جو اسلوب اور طرز نگارش اختیار کیا تھا، وہ دبستان شبلیؒ کا خاص انداز تھا، اس کا مطالعہ بھی شاہ صاحبؒ نے اچھی طرح کر لیا تھا، اور اسی کی پابندی کی۔

بنو امیہ اور بنو عباس کی تاریخ لکھنے میں جانکاہ تحقیق و تدقیق کی ضرورت نہ تھی، عربی زبان کی تاریخوں میں ان کی پوری تفصیل موجود تھی، صرف خوش سلیقگی اور خوش مذاقی سے ان کو اردو میں منتقل کرنے کی ضرورت تھی، شاہ صاحبؒ کی روزمرہ کی زندگی میں یہ اوصاف پائے جاتے تھے، اس لیے بنو امیہ اور بنو عباس کی تاریخ لکھنے میں ان سے ان کو بڑی مدد ملی، اس وقت تک اردو میں ابو الفضل عباسی گورکھپوری اور اکبر شاہ خان کی تاریخ اسلام موجود تھی، مولانا اسلم جیراج پوری نے تاریخ الامت لکھ کر ایک بڑے خلاء کو ضرور پر کیا، لیکن جب شاہ صاحبؒ کی تاریخ اسلام کی چاروں جلدیں شائع ہوئیں تو دبستان شبلیؒ کے اسلوب، تحریر کی شگفتگی، واقعات کی ترتیب کی خوش سلیقگی اور خود مصنف کی خوش مذاقی اور اعتدال پسندی کی وجہ سے بہت مقبول ہوئیں، یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کی گئیں، اساتذہ اور طلبہ دونوں ان کا مطالعہ کر کے مستفید ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کی تاریخ اسلام کی پہلی جلد ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی، سید صاحبؒ نے اپنے دیباچہ میں اس کی چاروں جلدوں کے متعلق یہ لکھا:

"اس پورے سلسلہ میں اسلام کے اخلاقی اثرات اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ کو خاص طور سے پیشِ نظر رکھا گیا ہے، یعنی اسلام سے پہلے دنیا کی اخلاقی حالت کیا تھی، اسلام نے کیا سبق دیا، اپنی تعلیم کے اس نے کیسے نمونے پیدا کیے، انھوں نے خود کہاں تک اس تعلیم پر عمل کیا، اور دوسروں کے ساتھ اس کو کہاں تک برتا، دنیا پر اس کے اثرات کیا پڑے، اور انسانیت کو اس سے کیا فوائد پہونچے، مسلمانوں نے علم و فن کی کیا خدمت کی، اور انسانی تہذیب و تمدن کا پیغام کہاں سے کہاں تک پہونچایا، اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اس کے اثرات و نتائج کے اعتبار سے سب سے روشن زمانہ عہد نبوت اور خلافت راشدہ کا ہے، اس لیے اس حصہ میں اس پہلو کو خاص طور سے دکھایا گیا ہے، سیاسی تاریخ یعنی فتوحات وغیرہ میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، اس کا کوئی ضروری پہلو چھوٹنے نہیں پایا، لیکن اس کی جزوی تفصیلات سے کتاب کو طول نہیں دیا گیا ہے کہ ایسی کتابوں کی کمی اردو زبان میں نہیں"۔

تاریخ اسلام کی چاروں جلدوں کی تدوین کے سلسلہ میں شاہ صاحبؒ کے ماخذ یہ تھے:

سیرۃ ابن ہشام، عقد الفرید، انقلاب الامم ابن صاعد اندلسی، امالی ابو علی قالی، زرقانی، ابو الصباح، روض الانف، طبقات ابن سعد، مستدرک حاکم، فتح الباری، مشکوٰۃ، بخاری، اصابہ، مسند ابن حنبل، زاد المعاد، مسلم، فتوح البلدان بلاذری، بیہقی، ترمذی، ابوداؤد، کنز العمال، ابن خلدون، ابن اثیر، طبری، تاریخ الخلفاء سیوطی، کتاب الخراج امام ابویوسف، اخبار الطوال دینوری، فتوح الشام، یعقوبی، خطط مقریزی، طبقات الفقہاء، بیہقی، ماوردی، سیرۃ عمر بن الخطابؓ از جوزی، سیرۃ العمرین لابن جوزی، ازالۃ الخفا، تذکرۃ الحفاظ، حسن المحاضرۃ، مسند دارمی، کتاب العمدۃ، تفسیر ابن جریر، اعلام الموقعین، نزہۃ الابرار، ابو الفداء، معارف ابن قتیبہ، الفخری، مروج الذہب مسعودی، دول الاسلام ذہبی، ابن اثیر، تاریخ خطیب، کتاب الوزراء والکتاب جہشیاری،

نجوم الزاہرہ ابن تغری بردی، خلاصۃ الوفاء، تمدن عرب، ابن خلکان، معارف ابن قتیبہ، کتاب الفرق بین الفرق، کشف الظنون، اخبار الحکماء، المستطرف، تاریخ الخمیس، معجم البلدان، دول الاسلام والحضارۃ العربیۃ، کتاب المحنۃ، البدایۃ والنہایۃ، کتاب الولاۃ کندی، کتاب الوزراء صابی، ابن العذاری، تجارب الامم، ہسٹری آف دی نیشنز، تاریخ فرشتہ، زین الاخبار گردیزی، جواہر مضیعہ، تاریخ ادبیات ایران، مراۃ الخیال، طبقات الشافعیۃ، راحۃ الصدور، تاریخ آل سلجوق، تاریخ مصر ابن میسر، تاریخ ذیل دمشق ابن القلانسی، دولت آل سلجوق، تاریخ گزیدہ، کتاب الملل والنحل شہرستانی، سیاست نامہ، تاریخ یورپ اے۔ جی گرانٹ، تاریخ یورپ الیور تھیچر، خطط الشام کرد علی، الاخبار السنیہ فی الحروب الصلیبیہ، تاریخ الدولتین زرکشی، المجب کتاب المونس، تاریخ دولت اتابکیہ موصل، صلاح الدین لین پول، کتاب الروضتین، حسن المحاضرۃ، الحروب الصلیبیہ، چنگیز خان ہرلڈ لیمب اردو ترجمہ، تاریخ جہاں کشائے جوینی، تاریخ گزیدہ۔

ان ماخذوں کو دیکھ کر ناظرین فیصلہ کر سکتے ہیں کہ شاہ صاحب نے ان جلدوں کے لکھنے میں پوری محنت کی، اور ہر قسم کے ماخذوں سے استفادہ کیا۔

تاریخ اسلام کی ابتدا رسالت اور خلافت راشدہ کے عہد سے ہوتی ہے، شاہ صاحب کے لیے یہ مشکل سوال تھا کہ اس عہد کی تاریخ مولانا شبلیؒ کی سیرۃ النبیؐ اور الفاروق اور حاجی معین الدین ندوی بہاری کی خلافت راشدہ (خلفائے راشدین) میں آچکی تھی، پھر انھوں نے خود سیر المہاجرین اور سیر الصحابہ جلد ششم میں بہت سے واقعات کا احاطہ کر لیا تھا، مگر ان کی تاریخ اسلام اس عہد کی تاریخ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے انھوں نے اب تک جو کچھ لکھا جاچکا تھا، اس کا عطر اپنی تاریخ اسلام کی پہلی جلد میں پیش کیا، اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اس جلد میں وہ سارے واقعات یکجا آگئے، جو مختلف کتابوں میں تھے، اس کے شروع میں قبل از اسلام عرب کے حالات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، ہجرت، غزوات، مذہبی انتظامات، تاسیس حکومت، ازواج مطہرات، اولاد امجاد کا بہت ہی جامع تذکرہ ملے گا۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حضرت علیؓ تک کے حالات ہیں، جن میں اختصار ضرور ہے، لیکن بڑی جامعیت ہے، اس کی تھوڑی سی جھلکیاں ناظرین کو دکھا دی جائیں تو مناسب ہوگا۔

حضرت ابوبکرؓ کی مدت خلافت دو سال تین مہینے اور دس دن رہی، اس قلیل مدت میں آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی وہ گراں قدر خدمات انجام دیں اور آیندہ حکمرانوں کے لیے ایسا نمونہ چھوڑ گئے جو دوسروں سے برسوں میں ممکن نہ تھا۔ (ص ۱۴۹) آپ نے سب سے زیادہ اس کا لحاظ رکھا کہ کسی امر میں عہد نبویؐ سے سرمو تجاوز نہ ہونے پائے، گو عہد رسالت کے قرب کے اثر سے اس کے تدارک کی ضرورت کم و بیش آتی تھی لیکن جہاں تجاوز کا ادنیٰ شائبہ بھی نظر آتا تھا، سختی کے ساتھ اس کا تدارک فرماتے، جہاں تک فتوحات اور نظام خلافت میں وسعت کا تعلق ہے، خلیفۂ ثانی کا زمانہ آپ کے زمانے سے زیادہ مہتم بالشان تھا، لیکن یہ اسی بنیاد کا نتیجہ تھا، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ رکھ گئے تھے، (ص ۱۴۹) عہد صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ کتابی شکل میں قرآن مجید کی جمع و ترتیب ہے، اس کے متعلق شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس سے عام غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ عہد نبویؐ میں قرآن مرتب نہ تھا، یعنی اس کی آیات اور سورتوں میں کوئی ترتیب نہ تھی، اور نہ سورتوں کے نام رکھے گئے تھے، یہ کام حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں انجام پایا، لیکن ایسا سمجھنا سراسر غلط ہے، قرآن کے احکام کی طرح اس کی آیات و سور کی ترتیب اور ان کے نام بھی الہامی ہیں، اور حیات نبویؐ میں قرآن کی پوری ترتیب ہو چکی تھی، قرآن اسی ترتیب کے مطابق ہے، البتہ کتابی صورت میں پورا قرآن جمع نہ تھا، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں یہی کام ہوا، (ص ۱۵۱)

حضرت ابوبکرؓ کے فضل و کمال اور سیرت کا اندازہ شاہ صاحبؒ کے اس تبصرہ سے ہوگا کہ جماعت صحابہؓ میں صدیق اکبرؓ سب سے زیادہ اسرار شریعت کے محرم اور روح اسلامی کے دانائے راز تھے، قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، جملہ اسلامی علوم میں آپ کا پایہ نہایت بلند تھا، قرآن پاک کے فہم و تدبر میں ایسا ذہن وقاد اور نظر دقیق پائی تھی کہ ان کی نظر ان نکات تک آسانی سے پہونچ جاتی تھی جن کی طرف

عام صحابہؓ کا ذہن منتقل نہ ہو سکتا تھا، خشوع و خضوع کا یہ عالم تھا کہ نماز کی حالت میں چوب خشک نظر آتے تھے، رقت اتنی طاری ہوتی کہ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی، عبرت پذیری کا یہ حال تھا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ ان کے لیے دفتر عبرت تھا، چڑیوں کو چہچہاتے دیکھتے تو فرماتے پرندو! تم خوش نصیب ہو کہ دنیا میں چرتے، چگتے اور درختوں کے سایے میں بیٹھتے ہو، قیامت کے محاسبہ کا کوئی خطرہ نہیں، کاش ابوبکر تمھاری طرح ہوتا، بات بات پر آہ سرد کھینچتے تھے، یہاں تک کہ اوّاہ لقب ہو گیا تھا۔ (ص ۱۵۵)

حضرت عمرؓ بن الخطاب کا دور خلافت تاریخ اسلام کا سب سے شاندار باب ہے، آپ کے زمانہ میں ایران، شام، مصر، بیت المقدس اور طرابلس الغرب پر اسلام کا پرچم لہرایا، ان فتوحات پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: بلاشبہہ سکندر، چنگیز اور تیمور نے ایک عالم کو زیر نگیں کیا، لیکن وہ صرف جہانگیر تھے، جہاندار نہ تھے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جس احتیاط اور جن قوانین کی پابندی کے ساتھ ایران و روم فتح ہوئے اس احتیاط کے ساتھ دنیا کا کوئی حکمراں زمین کا ایک حصہ بھی فتح نہیں کر سکتا، چنگیز اور تیمور وغیرہ طوفان کی طرح اٹھے اور ایک عالم پر چھا گئے، لیکن جب یہ طوفان تھما تو انسانی لاشوں کا انبار اور تباہ شدہ کھنڈروں کے علاوہ اور کوئی شے نظر نہ آتی تھی، وہ جن ملکوں سے گذرے انھیں ویرانہ بنادیا، اس کے برخلاف عہد فاروقی میں خون ناحق کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پایا، ملکوں کا تباہ کرنا تو بڑی بات ہے، ہری بھری کھیتیوں اور شاداب درختوں تک کو نہ کاٹتے تھے، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر تلوار اٹھانے کی سخت ممانعت تھی، پھر مسلمانوں نے جس ملک میں قدم رکھا اپنے عدل و انصاف اور حسن اخلاق سے اس کے باشندوں کو ایسا گرویدہ بنالیا کہ وہ اپنی قوم کے مقابلہ میں ان کے معاون و مددگار بن گئے، انھوں نے قوموں کے دل و دماغ کو مسخر کرلیا، اور بہت سی مفتوح قوموں نے ان کا مذہب بھی قبول کرلیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ملک فتح ہوئے، وہ سب کے سب آج تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔ (ص ۲۰۱ - ۲۰۰)

حضرت عمرؓ کو اپنی خلافت کے زمانہ میں جو اولیات حاصل ہوئیں، ان کو شاہ صاحبؒ نے مستند ماخذوں کے حوالہ سے دُہرا کر ان کی یاد ایک بار پھر تازہ کردی ہے، اور وہ یہ ہیں: (۱) بیت المال قائم کیا (۲) عدالتیں قائم کرکے قاضی مقرر کیے (۳) تاریخ اور سنہ قائم کیا، جو اب تک جاری ہے (۴) امیر المومنین کا لقب اختیار کیا (۵) فوجی دفتر ترتیب دیا (۶) والنیٹروں کی تنخواہیں مقرر کیں (۷) دفتر مال قائم کیا (۸) پیمائش کا طریقہ جاری کیا (۹) مردم شماری کرائی (۱۰) زراعت کی ترقی کے لیے نہریں کھدوائیں (۱۱) شہر آباد کیے، (۱۲) ممالک محروسہ کو صوبوں میں تقسیم کیا (۱۳) عشور یعنی دہ یکی مقرر کی (۱۴) دریا کی پیداوار مثلاً عنبر وغیرہ پر محصول لگایا (۱۵) تاجروں کو ملک میں آنے اور تجارت کرنے کی اجازت دی (۱۶) جیل خانہ قائم کیا (۱۷) درہ کا استعمال کیا (۱۸) راتوں کو گشت کرکے رعایا کا حال دریافت کرنے کا طریقہ نکالا (۱۹) پولیس کا محکمہ قائم کیا (۲۰) فوجی چھاؤنیاں قائم کیں (۲۱) گھوڑوں کی نسل میں اصیل اور دوغلے کی تمیز قائم کی جو عرب میں نہ تھی (۲۲) پرچہ نویس مقرر کیے (۲۳) مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک مسافروں کے آرام کے لیے چوکیاں اور سرائیں بنوائیں (۲۴) راہ پر پڑے ہوئے بچوں کی پرورش کے لیے روزینے مقرر کیے (۲۵) قاعدہ بنایا کہ اہل عرب غلام نہیں بنائے جاسکتے۔

(۲۶) مفلوک الحال عیسائیوں اور یہودیوں کے روزینے مقرر کیے (۲۷) مکاتب قائم کیے (۲۸) معلموں اور مدرسوں کے مشاہرے قائم کیے (۲۹) حضرت ابوبکرؓ سے اصرار کرکے کلام اللہ کی تدوین کرائی (۳۰) قیاس کا اصول قائم کیا (۳۱) فرایض میں عول کا مسئلہ ایجاد کیا (۳۲) فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کیا (۳۳) نماز تراویح جماعت کے ساتھ قائم کی (۳۴) تین طلاقوں کو جو ایک ساتھ دی جائیں بائن قرار دیا (۳۵) شراب کی حد اسی کوڑے مقرر کی (۳۶) تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی، (۳۷) بنی تغلب کے عیسائیوں پر جزیہ کے بجائے زکوٰۃ مقرر کی (۳۸) وقف کا طریقہ ایجاد کیا (۳۹) نماز جنازہ میں چار تکبیروں پر اجماع کرایا (۴۰) مساجد میں وعظ کا طریقہ جاری کیا (۴۱) امام اور مؤذن کی تنخواہیں مقرر کیں (۴۲) مسجدوں میں روشنی کا انتظام کیا، (۴۳) ہجو کہنے والے کے لیے درے کی سزا مقرر کی، (۴۴) غزلیہ اشعار میں عورتوں کے نام لینے سے منع کیا، (۲۴۴-۲۴۳)

حضرت عمرؓ کے اتباعِ سنت کا ذکر شاہ صاحبؒ نے اس طرح کیا ہے کہ آپ کسی کام میں سنت نبویؐ سے تجاوز نہ کرتے تھے، عبادات و معاملات کا ذکر نہیں، روزانہ کی زندگی میں اتباعِ سنت کا پورا اہتمام تھا، عمال کو پابندی سنت کے تاکیدی احکام بھیجتے رہتے کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں عمر کی جان ہے، اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روش سے ہٹ جاؤ گے تو خدا تم کو جادۂ مستقیم سے ہٹا دیگا، اتباعِ سنت کے خیال سے بڑی تنگی کی زندگی بسر کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت حفصہؓ نے عرض کیا کہ اب خدا نے مرفہ الحالی عطاء فرمائی ہے، اس لیے آپ کو نرم کپڑوں اور اچھی غذا سے پرہیز نہ کرنا چاہیے، حضرت عمرؓ نے جواب دیا: جانِ پدر! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسرت کی زندگی بھول گئیں، خدا کی قسم میں اپنے آقا کے نقش قدم پر چلوں گا کہ آخرت کی فراغت اور خوشحالی نصیب ہو، (ص ۲۳۸-۳۹)

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جو فتوحات ہوئیں ان سے شاہ صاحبؒ خوش تو ہوئے کہ اسلامی مملکت کے حدود ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحل اور یورپ کے صدر دروازہ تک وسیع ہوگئے (ص ۲۵۷) مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ فتوحات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، محاصل و خراج کی زیادتی، وظائف کی کثرت اور زراعت و تجارت کی ترقی نے ملک کو فارغ البالی اور عیش و تنعم کے سامانوں سے معمور کردیا، اس کے ساتھ ساتھ اس کے لوازم و نتائج بغض و حسد اور رشک و رقابت کا قدم بھی آیا، کبار صحابہؓ جو اسلام کے سچے خدمت گزار اور شیدائی تھے، اٹھتے جاتے تھے، ان کی جگہ نئی نسل لے رہی تھی، جن میں ان کے اسلاف کے جیسا خلوص و ولولہ کے بجائے مال و دولت کی ہوس تھی، نو مسلم یہودیوں اور مجوسیوں نے منافق بن کر بنی امیہ اور بنی ہاشم کی چشمک ابھاری، صورت حال اتنی بگڑی کہ نظام خلافت کو درہم برہم کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ پر طرح طرح کے الزامات رکھے گئے، مثلاً بعض اکابر صحابہؓ کے ساتھ

ناروا سلوک کیا، بیت المال کا روپیہ بے جا طور پر صرف کیا، اپنے اعزہ کو بڑی بڑی رقمیں دیں، بقیع کی چراگاہ کو اپنے لیے مخصوص کرلیا، اموی عمال کی بدعنوانیوں کا کوئی تدارک نہیں کیا، ایک مصحف کے علاوہ باقی تمام مصاحف جلوادیے، سنت رسول اور سنت شیخین کے خلاف منیٰ میں دو رکعت کے بجائے چار رکعت نماز پڑھی، فرائض میں تمام امت کے خلاف روایات شاذہ پر عمل کیا، حالانکہ شیخین پوری توثیق کے بغیر روایتوں کو قبول نہ کرتے تھے، حکم بن العاص کو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلاوطن کردیا تھا، دوبارہ مدینہ بلالیا، مصری وفد کے ساتھ بدعہدی کی، وغیرہ وغیرہ۔

شاہ صاحبؒ نے مدلل دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ان میں سے بعض تو بالکل غلط ہیں، بعض میں واقعات کو مسخ کرکے بدنما شکل میں پیش کیا گیا ہے، اور بعض غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ (ص ۲۷۰) مگر حالات اتنے بے قابو ہوگئے تھے کہ بقول حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ شہید ہوکر دھلے ہوئے کپڑے کی طرح پاک و صاف ہوگئے، اس شہادت سے ہر مسلمان کو دکھ ہے، اسی دکھ، رنج اور غم میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

حضرت عثمانؓ کی شہادت درحقیقت تنہا آپ کی شہادت کا واقعہ نہ تھا، بلکہ وحدت اسلامی کی شکست اور مسلمانوں کے شیرازہ کی برہمی کا حادثہ تھا، اس سے مسلمانوں میں جو تفریق پیدا ہوئی وہ تاقیامت نہ مٹے گی، اس وقت جو تلوار بے نیام ہوئی وہ ہمیشہ کے لیے بے نیام رہے گی، مسلمان شیعہ، سنی، خارجی اور عثمانی فرقوں میں بٹ گئے، اور جو متحدہ قوت غیر مسلموں اور اسلام کے دشمنوں کے مقابلہ میں صرف ہوتی تھی، وہ ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگی، اور عہد صحابہؓ سے جس خانہ جنگی کا آغاز ہوا، اس کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔ (ص ۲۸۹)

حضرت علیؓ کا پورا عہد خلافت خانہ جنگی اور اندرونی جھگڑوں میں گذرا، حضرت عثمانؓ کی شہادت کی وجہ سے طرح طرح کے واقعات رونما ہوئے، حضرت علیؓ نے خلیفہ بنتے ہی امیر معاویہؓ کو شام کی ولایت کے عہدہ سے معزول کردیا، جس سے وہ ہمیشہ کے لیے ان کے مخالف ہوگئے، ان سے

جنگ کی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے قصاص اور وقت کے فتنہ و فساد کی اصلاح کے لیے آگے بڑھیں یہاں تک کہ حضرت علیؓ سے جنگ ہوگئی، جو تاریخ میں جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے، اس جنگ میں حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار ہوکر فوج کی قیادت کررہی تھیں، بڑا عبرتناک منظر تھا، ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین حرم محترم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا تھیں، دوسری طرف جگر گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمہؓ کے شوہر نامدار، آپؐ کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ تھے، بڑی ہولناک جنگ ہوئی، عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت زبیر اور حضرت طلحہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ میدان میں جاں بحق ہوئے، بالآخر مصالحت ہوئی، شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ صلح کے بعد حضرت عائشہؓ نے فرمایا: میرے بچو!

یہ جنگ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی، اس لیے ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی سے کام نہ لینا چاہیے، میرے اور علیؓ کے درمیان جو ساس اور داماد میں اختلاف ہوجایا کرتا ہے وہی ہوا، اس کے علاوہ کوئی رنجش نہیں تھی وہ ان واقعات کے بعد بھی میرے نزدیک اخیار میں ہیں۔ (ص ۳۲۳)

حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد پر حضرت علیؓ نے فرمایا: ام المومنینؓ سچ فرماتی ہیں، خدا کی قسم میرے اور ان کے درمیان اس کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی، وہ دنیا اور آخرت دونوں میں نبیؐ کی حرم ہیں۔ (ص ۳۲۴)

اس جنگ کے بعد امیر معاویہؓ سے بھی تصادم کی نوبت آگئی، انھوں نے بھی حضرت عائشہؓ کی طرح حضرت عثمانؓ کے قتل کے قصاص کا نعرہ بلند کیا، اس کی آڑ لے کر حضرت علیؓ کے مقابلہ میں صفین کے میدان میں اتر آئے، شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اس جنگ میں پینتالیس ۴۵ ہزار شامی اور پچیس ۲۵ ہزار عراقی کام آئے، ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہوگئے، یہ مسلمانوں اور کافروں کی جنگ نہ تھی، بلکہ مسلمان مسلمان ہی سے لڑ رہے تھے، اور ایک دوسرے کا خون بہارہے تھے۔

امیر معاویہؓ کو جب اپنی شکست کا اندازہ ہونے لگا تو انھوں نے تحکیم کی تجویز پیش کی، جو حضرت علیؓ نے منظور کرلی، حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور امیر معاویہؓ کی طرف سے عمرو بن العاصؓ

حکم مقرر ہوئے، دونوں نے فیصلہ کیا کہ دونوں کو معزول کرکے خلافت کو شوریٰ پر چھوڑ دیا جائے، جب اعلان کا وقت آیا تو ابوموسیٰ اشعریؓ نے یہی اعلان کیا، لیکن عمرو بن العاصؓ نے اس کے برخلاف یہ اعلان کیا کہ ابوموسیٰ کی طرح میں بھی علیؓ کو معزول کرتا ہوں، لیکن معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں، اس فیصلہ سے حضرت علیؓ کے حامیوں میں سخت برہمی پیدا ہوگئی، حضرت علیؓ نے معاویہؓ سے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی، مگر اسی اثنا میں خارجیوں نے عراق میں بدامنی پھیلادی، امیر معاویہؓ نے مصر پر قبضہ کرلیا، پھر حضرت علیؓ کے دوسرے علاقہ کی طرف قدم بڑھایا، جس سے مسلسل خانہ جنگی اور خونریزی ہوتی رہی، حضرت علیؓ نے گھبرا کر امیر معاویہؓ سے ۴۰ھ میں صلح کرلی، اس کی رو سے حجاز، عراق اور مشرق کا پورا علاقہ حضرت علیؓ کے پاس رہا، اور شام اور مصر و مغرب کا علاقہ امیر معاویہؓ کے حصہ میں آیا، (ص ۳۵۶)

اس جھگڑے میں خارجیوں میں سے تین۳ شخصوں نے فیصلہ کیا کہ ایک ہی وقت میں ان تینوں یعنی حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ کو قتل کر دیں، امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ تو بچ گئے لیکن تیسرے شخص یعنی حضرت علیؓ پر عبدالرحمن بن ملجم کا وار کامیاب ہوگیا اور وہ شہید ہوگئے (ص ۳۵۷)

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تعمیری کاموں کے لحاظ سے حضرت علیؓ کا عہد آپ کے پیش روؤں کے مقابلہ میں ناکام رہا اور یہ ان حالات کا نتیجہ تھا جن میں آپ کو منصب خلافت ملا تھا اور جو بعد میں بھی پیش آتے رہے، ایسے مخالف حالات میں بڑے سے بڑا مدبر فرماں روا بھی مشکل سے عہدہ برآ ہوسکتا تھا، اور جس حد تک بھی آپ نے ان کا مقابلہ کیا وہ بھی کسی دوسرے فرماں روا سے ممکن نہ تھا، (ص ۳۵۹)

اس عہد کی باہمی آویزش کا تجزیہ کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: حضرت ابوبکرؓ نے جس وقت تخت خلافت پر قدم رکھا اس وقت سارا عرب پُرآشوب تھا، لیکن ان حالات کے مقابلہ کا پورا سامان موجود تھا، عہد رسالت کے قرب کی وجہ سے مسلمانوں میں اسلامی روح زندہ تھی، سب کے سب ایک غرض اور ایک مقصد اعلیٰ کے لیے متحد تھے، ان میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہوا تھا، حصول مقصد کے

وسائل پر تو اختلاف رائے ہو جاتا تھا، لیکن اصل مقصد پر سب متفق تھے، حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ضرور تھے لیکن خلافت کا نظام ان صاحب تدبیر و سیاست صحابہ کے مشورے سے چلتا تھا، جنھوں نے شجر اسلام کو اپنے خون سے سینچا تھا، ان کی عزیز ترین متاع اسلام تھا، ذاتی حیثیت سے حضرت ابوبکرؓ کا تحمل، آپ کی نرمی، تواضع، انکسار، لوگوں کے دلوں کی تسخیر، خلافت کے رکن رکین حضرت عمرؓ کا دبدبہ و شکوہ کسی کو جادۂ اعتدال سے ہٹنے نہ دیتا تھا، حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے یہ خصوصیات گھٹنے لگی تھیں جس کے نتائج انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوئے اور حضرت علیؓ کے دور میں قریب قریب سب ختم ہوئیں، نئی پود میں اپنے اسلاف کا اخلاص اور سچا جوش اور ولولہ نہ تھا، اس کے علاوہ جدید الاسلام عربوں اور نومسلم عجمیوں کے دلوں میں اسلام کیلئے کوئی تڑپ نہ تھی، ان کے سامنے اپنے اغراض ہوتے، ان ہی لوگوں نے اہل بیت اور غیر اہل بیت کا سوال پیدا کرکے مسلمانوں کے اتحاد اور یکجہتی کا خاتمہ کیا، حضرت عثمانؓ کو شہید کرکے مسلمانوں میں خانہ جنگی کا دروازہ کھولا، پھر حضرت علیؓ کی لاعلمی میں آپ کے ساتھ ہوکر اختلاف کی آگ بھڑکائی، اگر یہ عنصر نہ ہوتا تو جمل اور صفین کے واقعات پیش نہ آتے، (ص ۳۶۲)

کیسا پُرمغز اور جچا تُلا تجزیہ ہے۔

حیات سلیمان

یہ سید صاحب علیہ الرحمہ کی محض سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ سید صاحب کے پورے دور کی تمام ملی و قومی، سیاسی و علمی اور ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات تحریک جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و مآثر حجاز وغیرہ کی پوری تاریخ ہے، اس میں دارالمصنفین کی سال بسال ترقی کی روداد، ترک قیام دارالمصنفین، سفر بھوپال، پھر قیام پاکستان اور انھوں نے پاکستان میں جو علمی و ملی خدمات انجام دیں ان کی بھی تفصیل آگئی ہے، از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، قیمت ۳۲ روپیے۔ "منیجر"

سلسلۂ شطاریہ اور شاہ وجیہ الدین گجراتیؒ

از

عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی رفیق دارالمصنفین

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری (بارہویں اور چودہویں صدی عیسوی) میں ایران اور عراق سے تین مشہور سلاسلِ طریقت جنوبی ہند میں داخل ہوئے، چشتیہ، سہروردیہ اور فردوسیہ، سلسلۂ چشتیہ شمالی ہند میں زیادہ پھیلا، سلسلۂ سہروردیہ سندھ میں اور سلسلۂ فردوسیہ مشرقی ہندوستان کے بہار و بنگال میں پھیلا، مغلوں کے دورِ حکومت میں تین اور سلاسلِ طریقت نئے آئے، شطاریہ، قادریہ اور نقشبندیہ، سلسلۂ شطاریہ کے پیشوا شیخ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن آدم بسطامیؒ ([illegible] - ۲۶۰ھ) ہیں، اس سلسلہ کو ایران میں عشقیہ، روم میں بسطامیہ اور ہند و پاک میں شطاریہ کہتے ہیں۔

شطار کی وجہ تسمیہ | عشقیہ یا بسطامیہ سلسلہ کے لوگ اپنے کو شطاری کیوں کہتے ہیں، اور اس کی وجہ کیا ہے؟ گلزارِ ابرار کے مصنف محمد حسن غوثی جو اس مشرب سے تعلق رکھتے ہیں، لکھتے ہیں:

"شطار کی وجہ تسمیہ کے متعلق کسی اہلِ قلم نے کوئی صریح اور واضح بات نہیں لکھی ہے، لیکن ایک رسالہ ہے، "تطیفہ غیبیہ" نام کا جو شاہ عبداللہ شطاری کی تصنیف ہے، اس رسالہ کی فصلِ ثانی میں کسی قدر اس کی نسبت آگاہی دی گئی ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ خداشناس سالکِ امتِ محمدی سلوک میں تین مشرب رکھتے ہیں، (۱) اخیار، (۲) ابرار اور (۳) شطار، اور ان تینوں گروہوں میں سے ہر ایک گروہ ورد و شغل، ذکر، کشف اور قرب کی جدا جدا شان رکھتا ہے، اور اپنے خاص طریقے کے بموجب صاحبِ استعداد کا آئے

لہٰذا مناسب یہ ہے کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کے مضمون پر نظر کرکے فرق اور عدم فرق کی رعایت اس گروہ کے بارے میں بھی اسی کے مطابق کی جائے، جس طرح انبیاء علیہم السلام کے بارے میں قرآن شریف کے اندر ارشاد ہے، یعنی ان کی نسبت اعتقاد اور ولایت کے اقرار میں تفاوت اور اختلاف کو دخل نہ دیا جائے، اور جو حکم رسولوں کے ایمان کی نسبت لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ (یعنی ہم رسولوں میں سے کسی کے مابین فرق نہیں رکھتے ہیں) اسی پر قیاس کیا جائے، تاکہ شریعت کا ایسا ایمان حاصل ہو، جو طریقت کے وصف کے ساتھ موصوف ہو، اور جس طرح کہ انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں قرب، درجی، معجزات، نسخ اور عدم نسخ، اولو العزمی، امت کی کثرت و قلت اور نیز ان امور کے سوا دیگر امور کے اعتبار سے فرق سمجھا جاتا ہے، اسی طرح اس گروہ میں بھی فرق سمجھا جائے، چونکہ یہ گروہ مشابہ انبیاء بنی اسرائیل کے ہے لہٰذا اسی طرح اس گروہ کے اندر بھی افضلیت، سرعت سیر، بطوء سیر، ریاضت اور عبادت کے اعتبار سے سلوک میں بھی عالمِ آخرت کی طرف سے سمجھی جائے، اور احوال درجات مقامات اور خطابات کے اعتبار سے اعیانِ ثابتہ (صورِ علمیہ) کے بموجب منجانب مبدأ سمجھی جاوے، آیتِ کریمہ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ کے اشارہ سے جو معنی ذہن میں آتے ہیں ان کے مطابق اس مقام سے یہ بات خیال میں آتی ہے کہ اس لقب کی خصوصیت منازلِ طریقت کے طے کرنے میں تیز روی کے اعتبار سے ہے، العلم عند اللہ ..... چونکہ یہ گروہ عالمِ مرکبات کو طے کرکے مجردات کے عالم میں معنوی سرعت کے ساتھ جاتا ہے، اس سبب سے اس گروہ کو "شطار" کا لقب دیا گیا ہے[1]۔"

مشربِ شطار کے اصول | شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے دسویں صدی کے ایک بزرگ شیخ بہاء الدین بن ابراہیم الشطاریؒ کے تذکرہ میں ان کے ایک "رسالۂ شطاریہ" کے حوالہ سے مشربِ شطار کے دس اصول نقل کیے ہیں، جس میں موصوف نے لکھا ہے:

---

[1] اذکارِ ابرار ترجمہ گلزارِ ابرار ص ۲۰۵۔

"پہلا توبہ ہے، اس کا مقصد خدا کے سوا تمام مطلوب سے خروج ہے، دوسرا زہد ہے جس سے مقصد دنیا اور اس کی محبت، شہوات ولذات سے پرہیز ہے، خواہ وہ کتنی ہی تھوڑی ہوں، تیسرا توکل ہے، اور وہ اسباب سے خروج ہے، چوتھا قناعت ہے، اور اس سے نفسانی لذات سے علحدگی ہوجاتی ہے، پانچواں عزلت اور تنہائی ہے، اور وہ خلایق کے میل جول سے انقطاع ہے، بالکل اسی طرح جس طرح موت کے وقت ہوتی ہے، چھٹا حق تعالیٰ کی طرف توجہ اور التفات ہے، اور اس کا مقصد ہر بلانے والے سے جو غیر حق کی طرف بلائے اس سے بچنا ہے، جس طرح موت کے وقت نہ کوئی مطلوب ہوتا ہے اور نہ محبوب اور نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مقصود ہوتا، ساتواں صبر وضبط ہے، اور یہ مجاہدہ کے ساتھ ہوتا ہے، آٹھواں رضا ہے اور وہ نکلتا ہے نفس کی رضا سے خدا کی رضا میں داخل ہونے کے ساتھ، احکام ازلیہ کی تسلیم اور تدبیر الٰہی کی طرف تفویض کے ساتھ بغیر اغراض کے، جیسا کہ موت کے ساتھ ہوتا ہے، نواں ذکر ہے، اور وہ نکلتا ہے ماسوا اللہ کے ذکر سے، دسواں مراقبہ ہے، اور وہ نکلتا ہے اس کے وجود اور قوت سے جیسا کہ موت کے ساتھ ہوتا ہے"[1]

ان اصولوں کے بعد شیخ بہاء الدین شطاریؒ نے اس سلسلہ کے اذکار کی تفصیل دی ہے:

ہندوستان میں سلسلۂ شطاریہ کا فروغ

نویں صدی ہجری (پندرہویں صدی عیسوی) کے آخر میں شاہ عبداللہ شطاریؒ (م ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) ایران سے برصغیر ہند میں تشریف لائے، اور اس طریقہ کو جاری کیا، موصوف پانچ واسطوں سے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی اولاد میں ہیں، اور سات واسطوں سے حضرت بایزید بسطامیؒ سے بیعت ہیں، ہندوستان آکر انھوں نے کچھ وقت دیار پورب میں گذارا، اور پھر وہ مالوہ گئے، جہاں انھوں نے بڑا فروغ پایا، ان کا مزار مالوہ کے سابق دارالسلطنت مانڈو میں قلعہ کے اندر ہے، شاہ عبداللہ کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ شیخ محمد علاء المعروف بہ شیخ قاذن شطاریؒ

[1] اخبار الاخیار فی اسرار الابرار ص ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۲۷۸ھ۔

نے اس سلسلہ کو پھیلایا، ان کا مرکز ضلع مظفر پور (بہار) کا جنوبی علاقہ تھا، ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند اکبر شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست (م مابعد ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء) نے سلسلۂ شطاریہ کی اشاعت کی، ان کا مزار حاجی پور (بہار) کے قریب ہے، موصوف کے خلیفہ شیخ ظہور حاجی حمید الدین حضور (م ۹۳۰ھ/۱۵۲۳ء) نے اس سلسلہ کو بہت زیادہ فروغ دیا، ان کا مزار ضلع سارن میں رتن سرائے کے اندر واقع ہے۔

شیخ ظہور حاجی حمید الدین حضور کے انتقال کے بعد موصوف کے خلیفۂ اکبر حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ (۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء) سے سلسلۂ شطاریہ کی خوب اشاعت ہوئی، ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں ان کے خلفاء ومریدین پھیلے ہوئے تھے، غوثی نے گلزار ابرار میں جو فہرست دی ہے، وہ باختصار یوں ہے:

"گوالیار میں موصوف کے فرزند شیخ عبداللہ مسند نشین ہوئے، شیخ مبارک اور شیخ بدیع الزماں تنتری بھی یہیں تھے، اکبرآباد میں شاہ محمد غوث کے دوسرے فرزند شیخ نور الدین ضیاء اللہ مسند نشین تھے، شیخ عبداللہ صوفی بھی یہیں تھے، برہان پور میں شیخ اکمل الدین برہان، شیخ لشکر محمد عارف اور سراج محمد بنبانی سلسلہ کی اشاعت میں کوشاں تھے، بڑودہ میں شیخ صدر الدین، محمد شمس ذاکر اور شیخ حبیب شطاری فیض رساں تھے، احمد آباد میں شاہ محمد غوث کے دو صاحبزادگان شیخ محمد ادریس اور شیخ اسماعیل رونق افروز تھے، اعاظم خلفاء میں شیخ وجیہ الدین علوی اور شیخ علی شیر بنگالی مستفیض فرما رہے تھے، سنبھل میں شیخ محمد عاشق، اجمیر میں مولانا عبدالفتاح ناگوری، سرہند میں شیخ محمد جمالی، کالپی میں شیخ جلال واصل، بدولی میں شیخ جیو عبدالحی، بیجاپور میں شیخ شمس الدین شیرازی، اجین (مالوہ) میں شیخ احمد متوکل اور شیخ عالم، سارنگ پور میں شیخ منجھن و شیخ عمر وغیرہ، غرض سارے اطراف و اکناف میں خلفاء پھیلے ہوئے تھے"[1]

[1] اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار ص ۲۸۴ تا ۲۹۰۔

اس کے علاوہ شیخ علی قوامؒ (سید علی عاشقان سرائیمری) خلیفہ شیخ عبد القدوس نظام آبادیؒ کے ذریعہ بھی سلسلۂ شطاریہ کی اشاعت ہوئی، شیخ عبد القدوسؒ، شیخ حافظ کے خلیفہ تھے، اور موصوف شاہ عبد اللہ شطاری کے خلیفہ تھے، اس طرح ہند وپاک میں دو شاخوں سے سلسلۂ شطاریہ کو فروغ ہوا، سلسلۂ شطاریہ کا کافی عرصہ تک اثر ونفوذ رہا، اور بڑے بڑے علماء اور نامور شخصیتیں اس سلسلہ میں داخل ہوئیں۔

شاہ وجیہ الدین کی شخصیت

گجرات صدیوں سے گہوارۂ علم وفن اور سرچشمۂ روحانیت رہا ہے، یہاں کی خاک سے ایسے علماء، فضلاء اور صوفیہ پیدا ہوئے جن کے فیض سے ہندوستان کے اور علاقے فیض یاب ہوئے، گجرات کی عظیم المرتبت اور جامع کمالات ہستیوں میں حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ کی برگزیدہ شخصیت بھی ہے جن کے منبع علم سے جہاں ملک کے گوشہ گوشہ سے تشنگانِ علوم نے آکر اپنی پیاس بجھائی، وہاں ہزاروں بندگانِ خدا ان کے روحانی فیوض وبرکات سے بھی مالا مال ہوئے۔

شاہ وجیہ الدین ۲۲ محرم سنہ ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء کو چانپانیر (محمود آباد) میں پیدا ہوئے، تقریباً سات آٹھ برس وہ چانپانیر میں مقیم رہے، اس کے بعد ان کے والد ماجد قاضی نصر اللہ سلطان مظفر حلیم کے زمانہ میں احمد آباد منتقل ہوکر آگئے، تو ان کی نشو ونما احمد آباد ہی میں ہوئی۔

قدرت نے ابتدا ہی سے انھیں نیک طینت اور صالح بنایا تھا، ذہانت اور قوتِ یادداشت بلا کی پائی تھی، تقریباً سات سال کی عمر میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کرلیا اور آٹھویں سال تجوید کے ساتھ قرآن پاک علماء کے سامنے سنایا، اس کے بعد علوم متداولہ کی تحصیل میں مشغول ہوئے، اور اپنے چچا سید شمس الدین سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر اپنے ماموں سید ابو القاسم سے حدیث کا درس لیا، چودہ پندرہ سال کی عمر میں فن حدیث میں اس درجہ مہارت حاصل کرلی کہ اس زمانہ کے مشہور محدث علامہ محمد بن محمد مالکیؒ اور حضرت ابو البرکات عبد الملک بنبانی عباسیؒ سے باقاعدہ تحصیل کرکے ان سے سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد علوم عقلیہ کی طرف توجہ کی تو علامہ جلال الدین دوانیؒ کے مایۂ ناز شاگرد مولانا عماد الدین طارمیؒ اور ابو الفضل محمد مظہر الدین گازرونی کے سامنے

زانوے تلمذ تہ کیا اور چوبیس[۲۴] سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کرلی، تقریباً ستر[۷۰] سال تک احمد آباد میں معقول ومنقول کے پڑھانے میں اپنی اوقات بسر کی، اور شرح جامی سے لے کر تفسیر بیضاوی تک تیئیس[۲۳] کتابوں کے حواشی وشروح لکھے اور استاذ الاساتذہ کا منصب جلیل اپنی زندگی میں ان کو حاصل ہوگیا تھا۔[1]

شاہ وجیہ الدینؒ کو تصوف کے اعمال واشغال سے دلچسپی ابتدائے طالبعلمی ہی سے تھی، جب سلوک کی طرف میلان بڑھا تو پہلے اپنے والد ماجد سے چشتیہ اور مغربیہ طریقوں کو سیکھا، پھر اور شوق میں ترقی ہوئی تو کچھ دنوں حضرت شاہ قاضن چشتی نہروانیؒ کی صحبت سے مستفید ہوئے، شاہ قاضن کے انتقال کے بعد میاں بدر الدین ابو القاسم سہروردی کی طرف متوجہ ہوئے، اس دور کے ایک اور شیخ طریقت حضرت نجم الدین صدیقی سے بھی استفادہ کیا، بسا اوقات جذبہ وشوق کا غلبہ ہوتا تو حضرت سید کبیر الدین مجذوبؒ سے ملاقات کرتے اور دردِ دل کی شکایت فرماکر علاج کے طالب ہوتے، اس طرح اس زمانہ کے تمام مقبول سلسلہ ہائے تصوف کے اعمال اور اشغال سیکھے، اور ان کے مطابق اپنی زندگی ڈھالی بعد میں جب ان کی علمی قدر ومنزلت بڑھی، درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، منصب افتاء پر فائز ہوئے اور سلسلہ شطاریہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ گجرات تشریف لائے تو ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور مراحلِ سلوک کی تکمیل کرکے خرقہ خلافت پایا۔[2]

شاہ محمد غوثؒ کے حلقۂ ارادت میں آنے کا سبب

شاہ وجیہ الدین علویؒ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کے حلقۂ ارادت میں کیسے اور کب آئے؟ اس کے متعلق مختلف روایتیں ملتی ہیں، بعض

[1] اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، مصنفہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۱۶۳، ومنتخب التواریخ مصنفہ ملا بدایونی ج ۳ ص ۴۳ و ۴۴، وطبقات اکبری مصنفہ ملا نظام الدین بخشی ج ۲ ص ۲۷۳، اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار مصنفہ شیخ محمد حسن غوثی ص ۴۰۵ تا ۴۰۹، ومآثر الکرام مصنفہ غلام علی آزاد بلگرامی ج ۱ ص ۱۹۶ و ۱۹۷، ونزہۃ الخواطر مصنفہ مولانا سید عبد الحی حسنی ج ۴ ص ۳۸۵، تذکرہ علمائے ہند رحمان علی ص ۲۴۹ و ۲۵۰ وغیرہ

[2] مجموعہ حالات شاہ وجیہ الدین مرتبہ محمد یوسف متکلکیٹے، ص ۷۔

تذکرہ نگاروں نے شاہ محمد غوثؒ کے گجرات کے اندر واقعہ تکفیر کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی واقعہ شاہ وجیہ الدین کی بیعت اور خلافت کا ذریعہ بن گیا[1]، ایک روایت یہ بھی ہے کہ پہلے اپنے ماموں شیخ یحییٰ کے ساتھ شاہ محمد غوثؒ کی خدمت میں تشریف لائے اور شرف بیعت حاصل کیا[2]۔

حالانکہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قرین قیاس اور قابل وثوق شیخ عبدالنبی شطاری اکبرآبادیؒ کا بیان ہے، جسے انھوں نے اپنی کتاب "تذکرۂ اولیائے شطار[3]" میں لکھا ہے، اس بیان کی اور زیادہ اہمیت اس لیے ہے کہ شیخ عبدالنبی اور ان کے والد شیخ عبداللہ عثمانی سندیلوی ثم اکبرآبادی شاہ وجیہ الدین کے تلامذہ میں ہیں، اور برسوں ان کی صحبت میں رہے ہیں، شیخ عبدالنبی اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کے استادوں میں شیخ مبارک دانشمند اور شیخ وجیہ الدین گجراتی تھے، تحصیل علوم کے بعد دو سال تدریسی فرائض انجام دیے، پھر خدا طلبی کا جذبہ پیدا ہوا تو تمام کتابیں طلبہ میں تقسیم کرکے گوشۂ تنہائی اختیار کرلیا، اور ریاضتِ شاقہ میں مصروف ہوگئے، ان دنوں ان کے یہ دونوں استاد ان کے لیے افطار بھیج دیا کرتے، اسی اثنا میں یہ خبر پہونچی کہ حضرت شیخ محمد غوثؒ چانپانیر میں تشریف لائے ہیں، شیخ وجیہ الدین نے ان کے اوصاف و کمالات شیخ مبارک دانشمند سے سنے تو ان کے دل میں شیخ محمد غوث سے عقیدت پیدا ہوگئی، اس کا اظہار انھوں نے اپنے والد صاحب سے بھی کیا، جنھوں نے کہا کہ ملاقات سے پہلے استخارہ کرلیں تو بہتر رہے گا، شیخ وجیہ الدین نے فرمایا کہ زیادہ تر لوگ ان کی روحانیت کے قائل ہیں، اس لیے میری خواہش ہے کہ ان کی خدمت بابرکت میں جلد پہونچوں، ان کے والد نے کہا کہ کوئی اپنے دل میں نشانی سوچ لیں، اگر وہ واقعی مرد درویش ہوں گے تو پتہ چل جائے گا، ورنہ پھر لوگ آپ پر طعنہ زن ہوں گے، شیخ وجیہ الدین کو والد کی یہ بات پسند آئی، انھوں نے بڑی توجہ سے استخارہ کیا، دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

[1] تحفۃ الکرام، مصنف میر علی شیر قانع ج ۱، ص ۴۴۔ [2] مجموعۂ حالات شاہ وجیہ الدین، مرتبہ محمد یوسف کلکتہ، ص ۲

[3] تذکرۂ اولیائے شطار فارسی قلمی، مملوکہ دارالمصنفین۔

خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ شیخ محمد غوثؒ کو اللہ تعالیٰ اس دیار میں آپ کے لیے اور بعض دوسرے لوگوں کے لیے لایا ہے، چنانچہ دوسرے روز شیخ وجیہ الدینؒ نے فرمایا کہ مجھے حضرت محمد غوثؒ کی خدمت میں جانے کا حکم ہوگیا ہے، تم بھی ساتھ چلو، آخر شیخ وجیہ الدینؒ اور شیخ مبارک دانشمندؒ اس قدوۂ شطار کی خدمت میں چانپانیر پہونچے، شیخ وجیہ الدینؒ نے شیخ مبارکؒ سے کہا کہ وہ یہ نہ بتلائیں کہ یہ وجیہ الدینؒ ہیں، جب مرشد نامدار کے دربار میں پہونچے تو حضرت غوثؒ کی خادمہ چنپا دائیؒ نکل کر باہر آئی اور کہا کہ حضرتؒ نے فرمایا ہے کہ شیخ وجیہ الدینؒ اور شیخ مبارک دانشمندؒ احمد آباد سے آئے ہیں، ان سے کہو کہ تشریف رکھیں، فقیر بھی تجدید وضو کے بعد حاضر ہوتا ہے، یہ دونوں حضرات کچھ دیر بیٹھے تھے کہ حضرت غوثؒ باہر تشریف لائے اور بغل گیر ہوئے، اور فرمایا کہ میاں جی! حق تعالیٰ مجھے اس دیار میں آپ کے واسطے اور بعض دوسرے یاروں کے لیے لایا ہے، شیخ وجیہ الدین تعظیم بجالائے اور عرض کیا کہ حضرت والا کی خدمت میں ارادت کی غرض سے آیا ہوں، حضرت غوثؒ نے فرمایا کہ میاں جی! آپ کو مرید ہونے کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن میری جانب سے جو کچھ فیض مقدر ہے وہ آپ کو مل کر رہے گا، پھر حضرت غوثؒ نے اپنا خرقۂ مبارک شیخ وجیہ الدینؒ کو پہنا دیا اور فرمایا کہ میاں جی! آپ لوگوں کو ہدایت فرمائیں اور انھیں مرید کریں، حضرت غوثؒ نے انھیں چند روز اپنے یہاں ٹھہرا کر بعض مراقبات و اشغال تلقین فرمائے اور پھر انھیں احمد آباد رخصت کردیا، اور یہ بھی فرمایا کہ آپ چلیں، آپ کے پیچھے ہم بھی پہونچتے ہیں۔

شیخ وجیہ الدینؒ نے واپسی کے بعد والد سے حضرت غوثؒ کی بے حد تعریف کی، اور فرمایا کہ تم بھی انھیں دیکھ لوگے تو ان کے شیدا ہوجاؤ گے، والد صاحب نے کہا کہ جو کچھ ازل میں لکھا جاچکا ہے وہ ظاہر ہوکے رہے گا، چند دنوں کے بعد حضرت غوثؒ احمد آباد تشریف لائے، دستور خاں گجراتی کے خوبصورت اور دلکش باغ میں ورود فرمایا، شیخ وجیہ الدینؒ حضرت غوث کی ملاقات کیلیے چلنے لگے تو اصرار کرکے والد کو بھی ساتھ لے لیا، شیخ وجیہ الدینؒ برابر حضرت غوثؒ کی خدمت میں رہنے لگے، ایک روز کچھ ریاضت و مجاہدہ کے سلسلہ میں عرض کیا تو حضرت غوثؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے نتائج و

وثمرات ضرور ظاہر فرمائے گا، پھر تھوڑی دیر کے بعد شیخ وجیہ الدینؒ نے والد سے کہا کہ کیوں نہ آپ بھی اس سلسلہ میں داخل ہوجاتے؟ والد نے جواب میں کہا کہ یوں تو مشایخ کے بہت سے سلسلے ہیں لیکن میری طبیعت دوسروں سے الگ ہے، میں تو چاہتا ہوں کہ ایسے بزرگ کے حلقہ میں آؤں جو واقعی اللہ کی راہ میں اپنے کو فنا کرچکا ہو، اسی اثناء میں حضرت غوثؒ کی زبان مبارک سے نکلا کہ ہرن شیر کے پنجے میں آگیا ہے، لوگوں کو اس جملے پر حیرت ہوئی، تھوڑی دیر کے بعد عصر کی نماز حضرت غوثؒ کے ساتھ ادا کی اور رخصت ہونے لگے تو حضرت غوث بھی ان کے ساتھ کھڑے ہوگئے، بغل گیر ہوکر انھیں رخصت کیا...... سلطان محمود گجراتی نے قصبہ بھڑوچ کے کچھ گاؤں بطور مدد معاش حضرت غوث اور ان کے متعلقین کو عنایت فرمائے اور کہا کہ آپ فی الحال اسی جگہ قیام فرمائیں...... بھڑوچ کے دوران قیام شیخ وجیہ الدینؒ اور شیخ مبارک دانشمندؒ حضرت غوثؒ کی خدمت میں برابر آتے، اور بعض دفعہ دو تین مہینے گذارتے[1]"۔

شاہ محمد غوثؒ کی کیمیائی صحبت کا اثر

شاہ وجیہ الدینؒ اگرچہ علم وفضل کے اعتبار سے اپنے مرشد سے بہت آگے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ حضرت گوالیاریؒ کی ملاقات سے پہلے خدا کو نہیں جانتے تھے، انھیں ان کے مرشد ہی نے خدا تک پہونچایا ہے[2]، شاہ وجیہ الدینؒ کے مشہور شاگرد گلزار ابرار کے مصنف شیخ محمد حسن غوثیؒ لکھتے ہیں:

"شاہ صاحبؒ نے ایک تقریب کا موقع نکال کر یہ ماجرا بیان کیا کہ جن مقدمات پر الٰہی حقائق کی دریافت اور کشف موقوف ہے، ان مقدمات کی تحصیل کا شوق میرے دل میں بھی اس وقت پیدا ہوا جب کہ میں درس وتدریس میں مشغول تھا، ناگاہ مشیت ایزدی جس کی ہر ایک مقدر شے میں سو سو نکتے اور بھید ہیں، حضرت غوث کو گوالیار سے گجرات کی طرف کھینچ لائی، یہ صورت مجھے حضرت غوثؒ کی شرف پابوسی سے مشرف ہونے کا باعث ہوئی اور بہت تھوڑے عرصہ میں صاحب ممدوحؒ کی کیمیائی تربیت کے ذریعہ

---

[1] تذکرۂ اولیائے شطارہ فارسی قلمی ص ۲۲ تا ۲۵۔ [2] مجموعۂ ملفوظات قلمی ذخیرۂ شیروانی مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میرا اسلام تانبے سے کندن بن گیا، رسمی عقائد کی قید سے نکل کر حقیقی ایمان کی بہشت میں چہل قدمی کرنا نصیب ہوا، اور چند روز کے بعد خلافت کا خلعت پاکر سرفراز ہوگیا، اور پالیا جو کچھ پاس نہ تھا، اور جو کچھ پاس ہے پھر وہ نہ ملا ے

آنچہ حق بہر بندگان آراست   آرزو آنچناں نداند خواست[1]"

اسی طرح ایک اور مجلس میں شاہ وجیہ الدینؒ نے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت شاہ قاضن چشتیؒ کو خواب میں دیکھا کہ کسی درخت کے نیچے آرام فرما رہے ہیں، میں بھی وہاں پہونچ گیا، آپ نے کہا کون ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کا مرید، فرمایا: اس مرتبہ پر کیسے پہونچے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت محمد غوثؒ سے ملاقات کی بدولت، فرمانے لگے: شیخ محمد غوث تو ایسے ہی مردانِ خدا میں ہیں[2]"۔

شاہ محمد غوثؒ کی روحانی عظمت

شاہ وجیہ الدینؒ کو جس روحانی شخصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ شاہ محمد غوثؒ کی شخصیت ہے، شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کا سلسلۂ نسب خواجہ فرید الدین عطارؒ سے ملتا ہے، ان کی ولادت، رجب ۹۰۷ھ میں ہوئی، جب بارہ[12] سال کی عمر ہوئی تو طلب خدا میں سرگرداں پھرتے ہوئے جونپور تشریف لائے، اور قاضی صدر جہاں کے مکان پر قیام کیا، قیام کے دوران تحصیل علم میں مصروف رہے، کافیہ وغیرہ تک عبور حاصل کیا، پھر اسی کو کافی سمجھ کر علم باطنی کی تلاش میں مصروف ہوگئے، شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست کی خدمت میں فیض روحانی حاصل کیا، پھر انھی کی ہدایت پر حاجی حمید الدین حضور کی خدمت میں گئے، موصوف نے انھیں سلسلۂ شطاریہ میں بیعت فرمایا، آپ کے ساتھ آپ کے برادر بزرگ شیخ پھول (م ۹۴۵ھ ۱۵۳۸ء) بھی تھے، حاجی حمید الدین حضور نے دونوں بھائیوں کو اپنی فرزندی میں لیا، اور تعلیم وتلقین کے بعد شیخ پھول کو اپنے ہمراہ لے کر صوبہ بہار کی طرف روانہ ہوگئے، اور شیخ محمد غوثؒ کو مزید فیضان کے لیے کوہستان چنار میں ریاضت کے لیے چھوڑ دیا، شیخ محمد غوث

---

[1] اذکار ابرار ترجمۂ گلزار ابرار ص ۴۰۴۔ [2] مجموعۂ ملفوظات قلمی۔

تیرہ[۱] سال چند مہینے عبادت و ریاضت میں مشغول رہے، درختوں کے پتے کھا کر یادِ الٰہی کی، اس کے بعد جب حاجی حمید الدین حضورؒ کے واپس ہوئے تو مرید کو بامراد پایا، اسی عرصہ میں اپنی مشہور تصنیف "جواہر خمسہ" لکھی، حاجی حمید الدین حضورؒ نے تمام منازل سلوک طے کرائے اور خرقۂ خلافت عطا کیا۔

محمد حسن غوثی نے گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ محمد غوثؒ روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، انھوں نے حس کو قبول کر لیا، اس کے سر کی اور دل کی آنکھوں کو مشاہدہ اور معاینہ کا نور حاصل ہو گیا اور ان میں حقیقت بینی کی قوت آ گئی۔[۲]

مغل بادشاہوں میں ہمایوں ان کا نہایت قدردان اور عقیدت مند رہا، جلال الدین اکبر نے گراں بہا جاگیر مقرر کی، شیخ نے اس رقم سے گوالیار میں ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی، شیخ محمد غوث نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، رسالۂ معراجیہ، جواہر خمسہ، کلید مخازن، کنز الوحدۃ، ضمائر و بصائر ان سے یادگار ہیں، بحر الحیاۃ میں شیخ محمد غوثؒ نے ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال کو فارسی میں منتقل کیا اور اپنی ابتدائی تصنیف "جواہر خمسہ" میں بھی ان کی ایک آدھ جھلک دکھائی، اس سے شطاریہ طریقہ کے اس ارتباط پر روشنی پڑتی ہے جو اس کا ہندو یوگ سے تھا۔

گجرات میں شاہ محمد غوث کی آمد اور واقعۂ تکفیر

۹۴۷ھ میں جب افغان سور کا غلبہ ہوا اور شیر شاہ برسر اقتدار آیا تو اس نے شیخ محمد غوثؒ کو پریشان کرنا شروع کر دیا، چنانچہ مجبوراً وہ گجرات تشریف لائے چونکہ شیخ محمد غوثؒ سے نصیر الدین ہمایوں بادشاہ کو خاص عقیدت اور تعلق تھا اور بعض مہم میں آپ سے اس نے مشورہ بھی کیا تھا اور مراحم خسروانہ سے بھی سرفراز ہوئے تھے، اس لیے شیر شاہ کو ان سے کد پیدا ہو گئی تھی، اس کے علاوہ شیر شاہ کی ان سے نفرت کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ بعض حاسدوں نے ان کی تصنیف "معراج نامہ" شیر شاہ کے سامنے پیش کی اور یہ کہا کہ اس میں بہت سی باتیں شریعت کے خلاف ہیں

۱؎ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۲۸۹۔ ۲؎ اوراد غوثیہ مطبوعہ ۱۳۱۳ھ ص ۷۶۔

اس پر وہ غضبناک ہوا، اور ان کی ایذا رسانی کے درپے ہو گیا، اس لیے آپ گجرات چلے آئے، چنانچہ شیخ محمد غوث اپنی کتاب "اوراد غوثیہ" میں لکھتے ہیں :

"چہل سال بود کہ از بادشاہان تفاوت پیدا شد، سفر اختیار کردہ در ولایت گجرات آمد"[۱]

لیکن اس معراج نامہ کی شہرت گجرات میں بھی پہونچ چکی تھی، گجرات کے مقتدر علماء ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے، چنانچہ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں :

"انھوں نے عروج حال میں ایک کتاب موسوم بہ معراج نامہ تصنیف فرمائی تھی اور اسی میں اپنے عروج حال کے مقامات کا ذکر کیا تھا، جب ہمایوں معزول الریاستہ ہوا اور ہندوستان سے ایران چلا گیا تو حاسدوں نے شیخ کی تصنیف معراج نامہ شیر شاہ کے سامنے پیش کی اور کہا کہ اس میں شیخ نے بہت سی باتیں خلاف شرع لکھی ہیں، چنانچہ شیر شاہ ان کی ایذا رسانی کے درپے ہو گیا، مجبوراً شیخ گوالیار سے ہجرت فرما کر گجرات تشریف لائے، علمائے گجرات بھی شیخ کی دشمنی پر آمادہ ہو گئے اور محضر تیار کر کے قتل کے درپے ہوئے، ان حالات میں شیخ وجیہ الدین گجراتیؒ (جو گجرات کے علماء اور صلحاء اور مشائخ کے پیشوا تھے، اور شیخ محمد غوثؒ سے ان کو ارادت بھی تھی) نے فرمایا کہ جب علماء کی مجلس منعقد ہو اور معراج کے بارے میں بات آئے تو شیخ یہ فرما دیں کہ مجھ کو یہ معراج عالم خواب میں پیش آئی تھی، بیداری اور ہوش کے عالم میں نہیں، الغرض جب علماء کا معرکہ گرم ہوا تو شیخ نے فرمایا کہ یہ معراج اس وقت واقع ہوئی تھی جب کہ مجھے ظاہر کی کچھ خبر نہ تھی، چنانچہ اس تدبیر سے علمائے گجرات نے ان کی ایذا رسانی سے درگزر کیا"[۲]

ملا عبد القادر بدایونی اسی واقعہ کو دوسرے انداز سے لکھتے ہیں، چونکہ وہ شیخ کے ہمعصر ہیں اس لیے ان کا بیان زیادہ صحیح ہے :

"جب سلطان محمود گجراتی کے زمانہ میں شیخ محمد غوثؒ ہندوستان سے گجرات آئے تو شیخ علی متقیؒ نے جو

۱؎ اوراد غوثیہ، مطبوعہ ۱۳۱۳ھ ص ۷۶۔ ۲؎ خزینۃ الاصفیاء حصہ دوم مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۳ء ص ۴

مشائخ کبار اور علمائے وقت میں بڑے با اقتدار تھے ان کے قتل کا فتویٰ صادر کردیا، سلطان نے اس فتوے کو میاں وجیہ الدین کے دستخط و تصدیق پر منحصر کردیا، چونکہ میاں وجیہ الدین شیخ محمد غوثؒ کے گھر جاچکے تھے اور پہلی ہی بار میں ان کے شیدا و فریفتہ ہوگئے تھے اس لیے انھوں نے اس فتویٰ کو پھاڑکر پھینک دیا، جب شیخ علی متقیؒ کو معلوم ہوا تو وہ دوڑے ہوئے میاں صاحب کے گھر آئے اور اپنے کپڑے پھاڑدیے اور پوچھا: آپ بدعت کی اشاعت اور دین میں رخنہ اندازی پر کس طرح راضی ہوگئے؟ شاہ وجیہ الدینؒ جن کا قلب پہلے ہی شیخ گوالیاری کے دام الفت میں گرفتار ہوچکا تھا، جواب دیا، ہم اہل قال میں سے ہیں اور شیخ محمد غوث اہل حال میں سے ہیں، ہم ان کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتے اور ظاہری شریعت کے اعتبار سے بھی ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

پھر ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ شیخ محمد غوثؒ سے سلاطین گجرات کو جو عقیدت رہی ہے اس کا سبب یہی واقعہ ہے، میاں وجیہ الدینؒ کے رویے سے شیخ پھانسی سے بچ گئے، اس واقعہ کے بعد میاں صاحب اکثر اپنی مجلسوں میں فرمایا کرتے تھے: ظاہر شریعت پر ایسی ہی نظر ہونی چاہیے جیسی شیخ علی متقی کی ہے، اور حقایق پر ایسی جیسی ہمارے مرشد کی نظر ہے[1]۔

شیخ محمد غوثؒ اہل وعیال، مریدوں اور ساز وسامان کے ساتھ گجرات میں اٹھارہ سال رہے، کچھ وقت چانپانیر، بھڑوچ اور باقی وقت احمد آباد میں گذارا، اور پھر گجرات میں بھی بڑا اقتدار حاصل کیا، شاہ وگدا سب نے آپ سے فیض حاصل کیا۔

شطاریہ سلسلہ میں شاہ وجیہ الدین کا مرتبہ

ہندوستان میں بیشمار شطاری بزرگ گذرے ہیں لیکن علمی و روحانی لحاظ سے جو جامعیت شاہ وجیہ الدین میں تھی، وہ کسی میں نظر نہیں آتی، وہ جہاں اسلامی علوم وفنون میں تفسیر، حدیث، فقہ کے جید عالم تھے وہاں معقولات میں فلسفہ، منطق، کلام اور ہیئت میں بھی یگانۂ روزگار تھے

[1] منتخب التواریخ ج ۳، ص ۴۴، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء۔

اس پر مستزاد یہ کہ تصوف کے اسرار اور باطنی کیفیات کے راز داں بھی تھے، صوفیوں اور درویشوں کے اخلاق وعادات نے انھیں عوام میں بے حد مقبول بنادیا تھا، آپ کے علمی وروحانی کمالات کا اعتراف معاصرین علماء و فضلاء نے بھی کیا ہے، اور بعد کے مورخین و تذکرہ نگاروں نے بھی۔

آپ کے معاصر مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

"میاں وجیہ الدین احمد آبادی ...... اپنے زمانہ کے بڑے عابد و متقی عالم تھے، شریعت کی نہایت پابندی کرتے اور گوشہ نشینی ان کا شعار تھا، ہمیشہ دینی علوم کے درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے، تمام علوم عقلی ونقلی پر اس درجہ عبور تھا کہ درسی کتابوں میں صرف حاوی سے لے کر قانون، شفا، شرح مفتاح اور عضدی جیسی کتابوں میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو، ایک مخلوق ان سے فیض اٹھاتی رہی، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا میں بڑا اثر دیا تھا اور شفا رکھی تھی، چنانچہ ہر روز بیشمار مریض ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آتے تھے، اور ان کی دعا کا بھی بہت جلد اثر ہوتا تھا، وہ کبھی اپنے طور پر دنیا داروں کے گھر بھی نہیں گئے، بجز ایک دو بار کے وہ بھی طلب کرنے پر، نہایت کراہت کے ساتھ، اپنے گھر اور مسجد سے ان کا قدم جمعہ کی نماز کے سوا باہر نہیں نکلتا تھا، سب کے مرجع و مرکز تھے۔ وضع ولباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے، موٹے جھوٹے کپڑوں ہی پر قناعت کرتے تھے، جو کچھ نذر ونیاز آتی وہ خیرات کردیتے تھے، ارادت کا تعلق تو کسی اور سے تھا لیکن شیخ محمد غوثؒ سے تربیت وارشاد حاصل کیا تھا اور آداب طریقت میں ان کے پیرو تھے، انھیں کے پاس سلوک کی تکمیل کی تھی، صوفیانہ مشرب سے بڑا ذوق اور مناسبت تھی[1]۔"

دوسرے مشہور مورخ اور آپ کے معاصر خواجہ نظام الدین احمد بخشی لکھتے ہیں:

[1] منتخب التواریخ ج ۳، ص ۴۳، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء

"میاں وجیہ الدین گجراتی پچاس سال جادۂ ارشاد وہدایت پر متمکن رہے، فقر وفاقہ اور توکل میں زندگی بسر کی، ہر وقت درس دیا کرتے، علوم نقلی وعقلی سے خوب آگاہ تھے، عمدہ تصنیفات آپ کی ہیں، اور اکثر علمی کتابوں پر آپ نے شروح وحواشی لکھے ہیں[2]"۔

تیسرے معاصر ملا عبدالباقی نہاوندی ہیں جنھوں نے آپ سے استفادہ بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

...."اکثر ہندوستان کے متبحر علماء میاں صاحب موصوف سے شاگردی کا تعلق رکھتے ہیں، اس زمانہ کے فضلاء میں کوئی جامعیت میں ان کی ہمسری نہیں کرسکتا، مجاہدۂ نفس اور دنیاوی لذتوں سے کنارہ کشی میں کمال درجہ کوشش کی ہے، تزکیۂ نفس میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، میاں صاحبؒ کے عمدہ احوال کی حد درجہ شہرت ان کے تفصیلی حالات بیان کرنے سے روکتی ہے[3]"۔

چوتھے معاصر اور جید عالم شیخ عبدالقادر عیدروسی لکھتے ہیں:

"وہ اصحاب علم وزہد میں تھے، انھیں لوگوں میں بڑی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی، طلبہ نے آپ سے بہت سے فنون میں نفع اٹھایا، اور اس کی بڑی شہرت ہے[4]"۔

مشہور مورخ معتمد خان لکھتے ہیں:

"شیخ وجیہ الدین شیخ محمد غوثؒ کے خلفاء میں ہیں، لیکن ایسے خلیفہ کہ مرشد بھی ان کی خلافت پر ناز کرے، سوائے ان کے کوئی نہیں ملے گا، شیخ وجیہ الدینؒ کی ارادت حضرت شیخ محمد غوث کی عظمت کی بڑی واضح اور قطعی دلیل ہے، شیخ وجیہ الدینؒ ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں سے آراستہ تھے[5]"۔

ملا محمد صادق فرماتے ہیں:

---

[1] طبقات اکبری ج ۲، ص ۴۰۳۔ [2] مآثر رحیمی ص ۱۷، حصہ سوم، مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ [3] النور السافر عن اخبار القرن العاشر، ص ۲۵۶، مطبعۃ الفرات بغداد ۱۳۵۳ھ۔ [4] اقبال نامۂ جہانگیری مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۶۵ء، ص ۱۰۸۔

"شیخ وجیہ الدین قدس سرہ علوی ہیں، اپنے زمانہ کے علمائے کبار میں ہیں، صاحب تقویٰ اور بڑے محتاط، شریعت کے راستہ پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور ہمیشہ درس وافادہ میں مشغول رہتے[1]"۔

معارج الولایۃ کے مصنف غلام معین الدین فرماتے ہیں:

"شیخ وجیہ الدین علویؒ علوم ظاہری وباطنی کے جامع تھے، اور شیخ محمد غوثؒ کے خلیفہ تھے، مرید کسی اور سے تھے، نہایت سن رسیدہ، رات میں ریاضت ومجاہدہ کرتے اور دن کو طالبعلموں کے پڑھانے میں مشغول رہتے[2]"۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

"جب شیخ محمد غوث گوالیاری صاحب جواہر خمسہ گجرات میں وارد ہوئے تو شیخ وجیہ الدین ان کے جمال میں گم ہوگئے، اور انھی کے زیر سایہ طریقت کی انتہا تک پہونچے، طلبہ ان کے افادات عالیہ سے مستفید ہوئے اور مشرق ومغرب کو اپنے انوار وبرکات سے معمور کردیا[3]"۔

طریقۂ شطاریہ کی اشاعت میں شاہ وجیہ الدینؒ اور ان کے خلفاء کا حصہ

شاہ وجیہ الدین کی شخصیت گوناگوں اوصاف اور محاسن کا مجموعہ تھی، خانقاہ اور مدرسہ کے حدود سے کبھی باہر نہ گئے، مگر خلائق کا ہجوم ان کے آستانہ پر حاضر رہتا، جہاں ان سے چودہ سو آدمیوں کو فیض روحانی حاصل ہوا، وہاں ان کے تلامذہ کی تعداد ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیل گئی، شطاری سلسلہ کے بزرگوں میں آپ کے شاگردوں اور خلفاء کے ذریعہ سب سے پہلے اس طریقہ کی اشاعت عرب ممالک میں ہوئی، اور اس طریقہ کو علمی حلقہ میں خاص اہمیت دی گئی، شاہ صبغۃ اللہ بھڑوچی آپ کے مایۂ ناز شاگرد اور نامور

---

[1] طبقات شاہجہانی حصہ اول مخطوطہ ص ۳۱۶، مملوکہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
[2] معارج الولایۃ، مخطوطہ ج ۲ ص ۵۸۲، مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ۔ [3] سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، ص ۴۵۔

خلیفہ ہیں، جنھوں نے سرزمین حجاز میں طریقۂ شطاریہ کا سلسلہ شروع کیا، آپ نے شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کی کتاب "جواہر خمسہ" کا عربی زبان میں ترجمہ کیا، جس پر آپ کے شاگرد شیخ احمد شناوی نے حواشی لکھے، غلام علی آزاد بلگرامی اپنی کتاب 'مآثر الکرام' میں شیخ محمد عقیلہ مکی کی کتاب 'لسان الزمان' کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ شیخ کبیر عالم شہیر سید صبغۃ اللہ بن سید روح اللہ حسینی بھڑوچی شیخ المشائخ طریقۂ شطاریہ عشقیہ ہیں، اور وہ علوم و معارف کے جامع تھے اور ایک عالم کو ان سے نفع پہونچا، وہ ایک ایسی ہستی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ظاہر کیا اور یہاں شہرت بخشی، ان کے فیض یافتگان میں مدینہ کے عالم سید میر اور اسعد بلخی و شیخ احمد شناوی ہیں، انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں کتاب الوحدۃ (۲) رسالہ ادارۃ الدقائق (۳) ما لا یسع المرید ترک کل یوم من سنن القوم عربی میں ہیں[۱]"

مولانا سید عبدالحی حسنی "یاد ایام" میں لکھتے ہیں:

"شیخ احمد بن عبدالقدوس شناوی، ابوبکر بن محمود النسفی، محمد بن عمر بن محمد الحضرمی اور شیخ عبدالعظیم مکی جیسے سید صبغۃ اللہ کے شاگرد ہوئے، انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا، جو بلاد روم تک پہونچا، اور علماء نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، ان کے علاوہ اور بھی تصنیفات علمائے عرب کی فرمائش پر لکھیں، محمد بن فضل اللہ محبی نے خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر[۲] میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا اور نجم الدین غزی نے لطف السمر و قطف الثمر میں ان کی بڑی مدح و ثنا کی ہے[۳]"

شیخ احمد قشاشی (م ۱۶۶۰ء ب ۱۰۷۱ھ) اور ان کے جانشین ملا ابراہیم القرانی (م ۱۶۹۰ء ب ۱۱۰۱ھ) کی وساطت سے یہ سلسلہ جزائر انڈونیشیا، جاوا اور ساترا وغیرہ میں بھی پھیلا۔

---

[۱] مآثر الکرام ص ۴۲ تا ۴۴ [۲] ۳۴۳ و ۳۴۴، الجزء الثانی۔ [۳] یاد ایام ص ۱۶۸ و ۱۶۹۔

شاہ وجیہ الدینؒ کے شاگردوں میں جہاں شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوریؒ، قاضی جلال الدین ملتانی، حکیم عثمان بوبکانیؒ، شیخ یوسف بنگالیؒ، مولانا عثمان سنبھلیؒ، قاضی ضیاء الدین نیوتنیؒ، شیخ عبدالقادرؒ اور شیخ پیر محمدؒ جیسے جید علماء پیدا ہوئے، اور علمی دنیا میں خاصی شہرت حاصل کی، وہاں آپ کے ممتاز خلفاء ہیں، آپ کے صاحبزادے شاہ عبداللہؒ اور ان کے مریدوں کے ذریعہ سلسلۂ شطاریہ کی اشاعت بڑے پیمانہ پر دکن کے علاقہ میں ہوئی، شاہ عبداللہؒ کے خلیفہ شاہ ہاشم علوی بیجاپوریؒ کے ذریعہ خاص طور سے اس کو بڑا فروغ ہوا، روضۃ الاولیاء بیجاپور کے حاشیہ پر شاہ وجیہ الدینؒ کے چالیس[۲] خلفاء کے نام دیے گئے ہیں، ان میں سے سید یٰسین سامانویؒ سے بہار و بنگال کے لوگوں نے استفادہ کیا، حیدرآباد کے علاقے میں سید عبدالرحمٰن، قاضی عبداللہ بیجاپوری، سید علی بابا میر حسینی کے ذریعہ فیض پہونچا، شیخ عبدالملک سارنگ پوری، حکیم روح اللہ بھڑوچی، شیخ احمد گجراتی، شیخ کمال محمد عباسی کے ذریعہ بھی اس کی اشاعت ہوئی، اور پھر آپ کے حلقۂ تلامذہ میں بڑے بڑے مصنف پیدا ہوئے، محمد حسن غوثی منڈوی جیسے باخبر اور متوازن تذکرہ نگار اور شیخ عبدالنبی شطاری اکبرآبادی جیسے فاضل پیدا ہوئے جن کی پچاس[۵] سے زائد کتابوں کی فہرست تذکرۂ علمائے ہند میں درج ہے۔

تذکرۂ گلشنِ بیخار

از

جناب خالد حسن قادری صاحب ۔ لندن

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ و حسرتی کا تذکرہ گلشن بے خار اردو شعراء کے تذکروں میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے، ان کی تاریخ ولادت مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف درج کی ہے، لیکن زیادہ تر اتفاق ۱۸۰۶ء پر قرار پایا ہے[1]، لیکن یہ تاریخ درست نہیں معلوم ہوتی، تذکرہ گلشن بے خار کے دیباچہ کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

"ابتدائے ایں کارنامہ در ابتدائے سال ہزار و دو صد و چہل و ہشت از ہجرت بودہ و انتہا در انتہائے ہزار و دو صد و پنجاہ .... و امروز اشہب تیز گامِ عمرِ رواں بست و شش مرحلہ طے کردہ ......[2]"

یعنی سنہ ۱۲۵۰ھ میں ان کی عمر چھبیس[26] برس کی تھی، اس حساب سے ان کی ولادت سنہ ۱۲۲۴ھ ۔ سنہ ۱۸۰۹ء میں قرار پاتی ہے، اس سنہ کی تنقیح ایک دوسری طرح یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان کے فارسی دیباچہ میں لکھا ہے:

[1] نادرات غالب، جناب سید آفاق حسین کراچی، ص ۱۶۵، خطوط غالب، مولانا غلام رسول صاحب مہر لاہور ص ۵۶۰ گل رعنا، مولوی عبدالحئی، ص ۳۲۶، دلی کا دبستان شاعری، نورالحسن ہاشمی، ص ۲۵۷ ۔ تحقیق کی روشنی میں، ڈاکٹر عندلیب شادانی ۔ (نوٹ) صرف شادانی صاحب نے اس تاریخ سے اختلاف کیا ہے۔

[2] گلشن بے خار، لکھنؤ سنہ ۱۹۱۰ء، ص ۶ ۔

"..... در سال شانزدہم نیروے سخن گوئی دادند، شیوا بیانی برتر از عادت بخشیدند، و در بست و سیوم بال اعراض کرامت کردند، دیکبارہ دل ازیں شغل برگرفتند، ہر دو بار گراں بارِ منت نہادند، و آں روز بر ہزار و دو صد چہل افزوں بود و امروز بر چہل ہفت افزون است ......[1]"

یعنی آغاز شاعری کے وقت سنہ ۱۲۴۰ھ میں ان کی عمر سولہ[16] برس کی تھی، ۱۶ ۔ ۱۲۴۰ = سنہ ۱۲۲۴ھ ۔ سنہ ۱۸۰۹ء اسی طرح ترک شاعری کے وقت تیئیس[23] برس کی عمر تھی اور سنہ ۱۲۴۷ھ، ۲۳ ۔ ۱۲۴۷ = سنہ ۱۲۲۴ھ سنہ ۱۸۰۹ء ۔

تذکرہ گلشن بے خار جیسا کہ خود بیان کیا ہے سنہ ۱۲۴۸ھ میں مرتب کرنا شروع کیا اور سنہ ۱۲۵۰ھ کے اواخر میں مکمل کیا، آغاز ترتیب اور تکمیل تالیف کی دو تاریخیں بھی خود ہی نکالی ہیں، اور حق یہ ہے کہ بہت بے ساختہ اور عمدہ ہیں، محولۂ بالا دیباچہ تذکرہ گلشن بے خار میں لکھتے ہیں:

"..... بسلہ منتخب زیب تاریخ آغاز است و الحمد للہ علی حصول المقاصد و الشکر لہ تاریخ اتمام، و الحمد للہ علیٰ ذٰلک، و امروز اشہب تیز گامِ عمرِ رواں بست و شش مرحلہ طے کردہ ......[2]"

یہ فقرے اس قدر بے ساختہ ہیں کہ عام طور پر قاری کا ذہن اس طرف مبذول نہیں ہوتا، ورنہ "بسملہ منتخب زیب" سے سنہ ۱۲۴۸ھ اور اگلے پورے فقرے "الحمد للہ علی حصول المقاصد و الشکر لہ" سے سنہ ۱۲۵۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔

یہ تذکرہ کس طرح مرتب ہوا، اس کو بھی خود ہی نہایت مرصع اور رنگین نثر فارسی میں بڑے لطف کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کے ساتھ ہی اپنے متعلق بعض ایسے کلمات لکھ دیے ہیں جن سے بوئے تفاخر بلکہ تجبّر آتی ہے، اور اسی طرح کے بیانات سے ان کے نکتہ چینوں کو حاشیہ آرائی کا بجا طور پر موقع ہاتھ لگا، دیباچہ میں لکھتے ہیں: دوستوں کی خاطر ایک بیاض جمع ہو گئی "روشن تر از سپیدۂ صبحِ صادق، گلستانے آراستہ شد رنگین تر از صفحۂ خیالِ عاشق" اور ایک تذکرہ ترتیب پا گیا جس میں "بغایت مختصر" طور پر ریختہ گویان بلاغت طرازہ

[1] کلیات شیفتہ مرتبہ جناب کلب علی خاں صاحب فائق، لاہور، ص ۳۸، سنہ ۱۹۶۵ء [2] گلشن بے خار، محولۂ بالا، ص ۶ ۔

کا کلام تھا، لیکن پھر کہتے ہیں کہ میں کہاں اور یہ وبال کہاں۔ اس کے بعد جو فقرے لکھے ہیں وہ دلچسپ ہیں،

"داد از خویشتن ناشناسی باشایستہ قدر من نبود کہ طلسم تازہ دریں کہنہ رواق بر بستمے و لوح ہیولانی بر فرق افلاطون و ارسطو شکستمے کہ از فرط کبر و ناز بہ ژاژ بونصر و بوعلی چشم التفات نمی کشادم و گوشِ رغبت نمی نہادم، بایں ترہات چگونہ سرو کارم افتاد۔ بیت

من مرغ خوش ترانۂ باغ فضیلتم — طبع مرا بزمزمۂ شاعری چہ کار ......"[1]

اے نواب صاحب کے نشۂ جوانی کی ترنگ سمجھنا چاہیے، عمر کا بھی کچھ تقاضا ہوتا ہے، اگرچہ غیر معمولی ذہانت کے علاوہ علوم رسمیہ کی تکمیل بھی کر چکے تھے، لیکن پھر بھی صرف چھبیس ۲۶ برس کی ہی عمر تھی، عرفی کی طرح اس کم عمری میں ہی بلا شبہ قابل رشک مہارت اور قدرت بہم پہونچالی تھی، فارسی کی رنگینی، فقروں کا در و بست، الفاظ کا انتخاب، حسن بیان اور لطف معانی کے لحاظ سے شیفتہ کی فارسی نثر بھی ایک خاص انداز رکھتی ہے، یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ غالب اور عرفی کی طرح وہ بھی شاعری کو "دونِ مرتبۂ من است" کہتے ہیں[2]۔ اور مزید لطف یہ کہ شاعری ہی نہیں بلکہ ریختہ گوئی اور زبان اردو دونوں کو ہی کچھ قابلِ وقعت نہیں گردانتے، اسی محولہ بالا دیباچہ میں آگے چل کر کہتے ہیں کہ ایک "یارِ عزیز، حبیبِ دلخواہ" نے کہا کہ کیا اچھا ہو اگر ایک بیاض مرتب ہو جائے جس میں "ذکر اسلاف کبار و اخلاف سعادت آثار" ہو، اور یہ مجموعہ نصرت ہر وقت اور ہمیشہ دوستوں کی طرح ہمدمی و ہم جلیسی کرے گا، بلکہ بقائے دوام بھی اس ذکر واذکار کو حاصل ہو جائے گی، اس مشورہ اور فرمائش پر شیفتہ کا جواب ملاحظہ ہو:

"...... گفتمش اے مرغ دلم شکارِ تو طائر سدرہ نشین را بر چوب مغیل آشیاں مبند و شناور قلزم را

۱؎ گلشن بے خار، محولہ بالا، ص ۴۔

۲؎ اگر او نام ز ننگ شد از ذلتِ شعر — شعر از عزت او نیک برآید ز ذلل (عرفی شیرازی)

(شعر العجم شبلی نعمانی ۱۹۵۶ء، ص ۱۰۲)

افتادہ در وحل مپسند، سرت گردم من و سودائے شعر و آں گاہ ریختہ ......"

ترجمہ:۔ میں نے اس سے کہا: اے وہ کہ میرا طائرِ دل تیرا شکار، تو [مجھ] طائرِ سدرہ نشین کیلیے ببول کی ٹہنی پر آشیانہ مت بنا، اور یہ نہ پسند کر کہ [مجھ جیسا] شناورِ قلزم کیچڑ میں پھنسے۔ میں تیرے قربان میں اور سودائے شاعری! اور پھر وہ بھی ریختہ!! ......

شیفتہ کا وہ یارِ عزیز اور حبیب دلخواہ جس تے ان سے فرمائش کی تھی ان کی اس خودستائی سے نہ صرف یہ کہ مرعوب نہیں ہوا بلکہ خاصی صاف بیانی سے نواب صاحب سے کہدیا کہ:

"...... نہ اگر دانشہائے پیشنت محیطِ دلم بودے منسوب بجنونت می نمودم و در اثبات ایں محتاج برہان و دلیل نبودم کہ ایں حرف نہ اگر ہذیانست از چیست ......"[1]

ترجمہ:۔ اگر تمھاری پہلی عقل کی باتیں میرے دل پر نہ چھائی ہوتیں تو میں تمھیں دیوانہ گردانتا اور اس بات کے ثبوت میں مطلق کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہ سمجھتا کہ اگر یہ [جو کچھ تم نے کہا] ہذیان نہیں تو اور کیا ہے ......

شیفتہ کے اس محب صادق نے صرف یہی نہیں کہا، بلکہ اردو زبان کی تحقیر پر بھی نواب صاحب کی طبیعت صاف کی، پہلے تو شعر و شاعری کی اہمیت کو مختصر مگر موثر الفاظ میں واضح کر کے یہ شعر سنایا:

مداں رتبۂ شعر را سر سری — بود شاعری بعد پیغمبری

اس کے بعد زرا دلنشین انداز میں کہا:[2]

"اور یہ جو ریختہ کو تم نے حقیر ترجانا اور اس زبان کو نہایت درجہ ادنیٰ سمجھا تو کیا یہ نہیں سمجھتے کہ اصل مدعا تو معانی سے ہے، لہٰذا جو بھی معانی تازہ الفاظ فصاحت افزا کو بخشے جائیں وہ قابل ستائش اور گوش دل و جان سے سننے کے لائق ہیں ......"

۱؎ گلشن بے خار محولہ بالا، ص ۵۔ ۲؎ ایضاً، ص ۵۔

اس گفتگو اور انہام وتفہیم کے بعد شیفتہ نے تذکرۂ شعرا مرتب کرنے کا واثق ارادہ کرلیا، انھوں نے اپنے تذکرہ میں کن امور کا التزام کیا اور کس طرح انتخاب عمل میں آیا اور کیا معیار ان کے ذہن میں تھا، اس کی طرف واضح طور پر انھوں نے اپنے تذکرۂ صدر دیباچہ میں اشارے کردیے ہیں، تذکرہ کے لیے فراہمی مواد کے سلسلہ میں تین معروف طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں، اولاً شعراء کے دواوین فراہم کرکے اس سے انتخاب کیا جائے، ثانیاً اگر دواوین فراہم نہ ہوسکیں تو جو بیاضیں اور تذکرے پہلے مرتب ہوچکے ہوں اور دستیاب ہوسکیں ان سے کلام و معلومات حاصل کیے جائیں، ثالثاً خود اپنے طور پر جو کلام شعراء اور حالات و معلومات علاوہ ان دو ذرایع کے حاصل کیے ہوں انھیں درج کیا جائے، شیفتہ نے بھی اپنے دیباچہ میں اسی طریقۂ کار کا ذکر کیا ہے، کہتے ہیں:

"دواوین اساتذۂ سلف وخلف بدقت و نصفت ملاحظہ واز اں التقاط کردم، دو دیوان کہ یکہ بنظر نرسیدہ و دست بہم نہ داد انکارش از تذکرہ ہا و سفاین وہر آنچہ بخاطر بود بدستور بہ نقطۂ انتخاب موشح وثبت افتاد ....."[1]

تذکرہ نگاری کا مقصد بھی شیفتہ کے نزدیک دیگر مصنفین سے ذرا مختلف تھا، وہ محض شعراء کے ناموں کی طویل فہرست مرتب کرنی نہیں چاہتے تھے، بلکہ شاعروں کے احوال کے سوا عمدہ اشعار کی بیاض مرتب کرنا بھی ایک مقصد تھا، اس لیے جہاں اکثر تمام مشہور اساتذہ کے نام آگئے ہیں، وہاں بعض ایسے شعراء کے حال چھوڑ دیے ہیں جن کے کلام میں ان کے نزدیک کچھ لطافت بیان اور لطفِ سخن نہ پایا گیا کیونکہ ان کے خیال میں مشکل سے کوئی مشہور استاذ ایسا ہوگا جس کا ایک شعر بھی قابل انتخاب نہ ہو، اسکے ساتھ ہی انھوں نے نہایت دیانت سے اس بات کا اعتراف بھی کنایۃً کیا ہے کہ دو سال کی مدت ایک معقول تذکرے کی تالیف کے لیے کافی نہیں، اور اسے نہایت خوبصورتی سے صرف ایک لفظ میں

۱؎ گلشن بےخار، محولۂ بالا ص ۵

بیان کر دیا ہے، یعنی اپنی اس تحریر [تذکرے] کو عجالہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جلدی اور عجلت میں منضبط کی ہوئی تحریر۔ اور اسی لیے کہتے ہیں کہ اگر کسی قابل ذکر شاعر کا بیان اور "خیالات شیریں و افکار نمکیں" کا حوالہ اس عجالہ میں نہ ملے تو مصنف کو تصور وار قرار نہ دیں، بلکہ یہ سمجھیں کہ اس کا حال و کلام اس تک پہونچ ہی نہ سکا۔

دیباچہ کے الفاظ یہ ہیں:

"......چوں مدنگاہ ایں تالیف و مطمح نظر ازیں تصنیف فرد آوردن اشعار دل آراست نہ شمار اسامی شعراء از انکہ سامعہ فریب بہ نظر نہ رسید، عام تر از نجا ہیل و معارف واحیا و اموات نامش دریں سفینہ چوں ابیاتش درج نگردید، اما از مشاہیر کم کسے است کہ شعرے لائق نداشتہ باشد، ناگزیر ایراد ہمہ شاں لازم آمدہ من غیر التزام وبایں علت اکثرے مدعیان کاذب را دریں اوراق نہ بینی جہل از حال شاں بتقصیر نسبت نہ کنی، و اگر یکے با خیالات شیریں و افکار نمکیں دریں عجالہ ذکرے نیست پنداری کہ بما نرسیدہ ......"[1]

نقاد کا منصب ہے کہ وہ دوستی و دشمنی کی سطح سے بلند ہوکر جو معیار اور اقدار اس نے اپنے لیے مقرر کیے ہیں، صرف انھی کے پیمانے سے کلام کو جانچے اور تولے، مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے اس کے معیار و اقدار سے اختلاف کرنا چاہیں تو کریں، لیکن انھیں نقاد کی ادبی دیانت اور غیر جانب داری پر شبہہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے، شیفتہ نے اسی اصول کو مدنظر رکھا ہے، اور دیباچہ میں صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ:

"...... از مہر و کین احباب و اعداء ان شاء اللہ چوں دل اہل صفا دریں بیاض اثرے نیابی واز اں مختصر آمد تا بطالت نہ انجامد ......"[2]

۱؎ گلشن بےخار، محولۂ بالا ص ۵-۶ ۲؎ ایضاً ص ۶

آخری فقرہ قابل غور ہے، جہاں وہ اپنے مخصوص انداز نظر کے باعث بظاہر خردہ گیری اور نکتہ چینی پر مائل نظر آتے ہیں، وہاں بھی انھوں نے اختصار کو اس لیے ملحوظ رکھا ہے کہ سخنہائے گفتنی کہنے سے کسی دل پر گردِ ملال کا دھبہ نہ پڑے، لیکن اس احتیاطِ بیان واحترامِ زبان کے عزم کے باوجود شیفتہ نے جو کچھ کہا اور جس طرح کہا اس نے بعض ادب نوازوں کے سینوں کو ایسا برمایا کہ گویا زبانِ حال سے کہہ اٹھے کہ ع مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا۔" اور جس جس کو زمانہ نے فرصت دی، اس نے واقعی تماشا بھی دکھا دیا۔

شیفتہ کی اصابتِ فکر، ژرفِ نظر، نکتہ دانی، سخن فہمی اور نقد و نظر کی صلاحیتوں سے انکار محال ہے، لیکن شیفتہ کے مزاج کی تشکیل اور خیالات و افکار کی ترتیب میں جو عناصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، انھیں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، وہ ہماری مشرقی تہذیب کا شائستہ نمونہ تھے، ادب ان کے ہاں واقعی ادب کا نام تھا، ان کے ذہن نے ادب بمعنی تعلیم و تعلم اور ادب بمعنی شائستگی و تہذیب دونوں کا ادراک غیر منقسم وحدت کے طور پر کیا تھا، بے راہ روی، ژولیدہ بیانی، بے مقصد سطحیت، کردار کی بے تہی اور خیالات کی بے مائگی، عوام پسندی کی بیساکھیوں کے سہارے ان کے ادبی گلیاروں میں ہنگامۂ بے ہنگام نہیں برپا کر سکتی، ان کے اس احتسابی کردار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان کا یہ ادبی تقشف کچھ بہت زیادہ مستحسن بھی نہیں، لیکن ان کا مزاج ان کی خاندانی روایات کے سانچے میں ڈھلا تھا اور ان کی طینت و سرشت مسلمانوں کی کئی سو سالہ تہذیب و شائستگی کی دین تھی۔

اس عہد کے شرفائے ادب اگر ادب و شاعری کے عوامی کردار کا صحیح اندازہ نہ کر سکے تو اس میں کسی ایک فرد کو بہت کچھ قصور وار نہیں گردانا چاہیے۔

ع۔ تمام شہر ہے، دو چار، دس کی بات نہیں

شیفتہ کے نکھرے ہوئے ادبی مزاج اور سلجھی ہوئی تنقیدی صلاحیتوں پر اب دلائل و براہین لانے کی ضرورت نہیں رہی، آزردہ، صہبائی، غالب، حالی سب نے مختلف انداز میں ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے، حالی کی رائے اب قولِ مشہور کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اس کا نقل کرنا بھی غیر ضروری ہے، البتہ ہم آزردہ اور غالب کے چند فقرے نقل کرتے ہیں، آزردہ گلشنِ بے خار کی تقریظ میں لکھتے ہیں:

"نقد سخن را تنقیدِ ذہن نقادش درکار است و از غورِ طبع وقادش ناچار چہ تا زر بمحکِ امتحان نرسد روئے کامل عیاری نہ بیند، و طلائے ناب تا در بوتہ گداز نیاید بنقش سکہ درست نہ نشیند۔ نقطۂ انتخابش خال رخسار عرائس اشعار...... شعرے کہ بانتخابش نرسیدہ چوں حرفیست مشکوک و بیتے کہ بروئے انتقادش نہ دیدہ ہمچو طلائے ست غیر مسکوک......"[1]

آخری جملے میں جو بات آزردہ نے نثر میں کہی ہے، غالب اس سے پہلے غزل میں کہہ چکے تھے:

غالب بفنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او ۔۔۔ ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

شیفتہ نے جن شعرا کی تعریف کی ہے ان میں سے بیشتر وہی ہیں جن کی تعریف آج تک تمام سخن سنج و سخن فہم نقاد کرتے چلے آئے ہیں، لیکن بعض کی تعریف کے سلسلہ میں شیفتہ نے جو صیغے افعل التفضیل کے استعمال کیے وہ ان کے حریفوں کے لیے تو ثقیل تھے ہی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کے ممدوحین کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا کہ "رکاب قزل ارسلان کی بوسہ دہی کے لیے کرسیِ نہ فلک زیر پائے اندیشہ"[2] رکھدی گئی ہے، چنانچہ شیفتہ کے ایک ممدوح اور مادح غالب نے اپنی تقریظ میں شیفتہ کی

---

[1] گلشن بے خار بحوالہ بالا ص ۲۵۴ [2] کلیات غالب نظم فارسی، نولکشور پریس ۱۲۹۳ھ، ص ۱۹۴۔

[3] ظہیر فاریابی [وفات ۱۲۰۲ھ] نے قزل ارسلان کی مدح میں لکھا تھا،

نہ کرسیِ فلک نہد اندیشہ زیر پائے ۔۔۔ تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

باقی (صفحہ ۱۳۶ پر)

وقتِ نظر، خوب سے خوب تر کی جستجو اور دشوار پسندی کی خو کو سراہنے کے بعد اس بات کا بھی اندیشہ ظاہر کر دیا کہ بعض خردہ گیروں کو ان کی اس روش پر نہ صرف اعتراض ہوگا، بلکہ عیب جو طبیعتیں اور بدبیں نگاہیں تلاشِ معایب میں مصروف رہیں گی، اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں[1]:

"نواب ہمایوں آثار والا شان وخان فرد ہیدہ فرہنگ پسندیدہ گفتار آزادہ دادگرائے دانش اندوز و سخن گوئے گرامی نہاد مبارک نفس دورت مہر پیشہ دفاگوہر نواب مصطفٰی خان بہادر... بہ فراہم آوردن تذکرۂ ریختہ گویان قدسی انجمنے برآراستہ ...... وبہ نظارۂ آب وتاب ِعشائی ایں دیرستان آتش کدہ پارس راز آتش بتے دیگر در نہاد دادۂ۔ از رشک ذوق بخشی ہنجار ایں زمزمہ وغیرت انداز رقم سنج ایں تذکرہ وحد عیش تماشائے ایں ہنگامہ لمحہ در اندام مدعیان بدانساں نیفتادہ کہ بار بدراز خمہ از سر انگشت، بلکہ زہرہ را نغمہ از ساز ومانی را خامہ از کف بلکہ عطار در انقش از قلم دپرویز را ادوق از ساتگیں، بلکہ بادہ را تندی از خویش فرو ریزد .... دانم کہ دیدہ ہا آجو بین است وگروہے از نکتہ چیناں در کمیں، باہم سرایند کہ فلانے در ستودن مبالغہ از اندازہ بردو بگزاف داد تر زبانی داد، ہے ہے، مدحِ سخن وآنگہ گمان اغراق نہ آخر بہ تبلیغ وعلو بخشی از گفتار نوعے از کلام است، لاجرم سخن راچناں کہ ستایند سرمایۂ نطق ہم از گنجینۂ اوست، واز ہر در کہ بجلوہ درآیند ہم در آئینۂ اوست...."

مولوی امام بخش صہبائی اس دور کے امامِ فن اور دیدہ ور عالم تھے، ایسے کہ لوگ ان کے فیضِ صحبت کے قائل اور جنھیں ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا، بجا طور پر اس پر نازاں تھے، غالب نے اگرچہ ان کی شہادت [۱۸۵۷ء] کے برسوں بعد بے وجہ ان پر فقرے چست کیے اور لکھا:

"......میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ پوچ پر جس کو صہباد کا تلمذ موجب عزّ ووقار ہو...."[1]

پھر ایک دوسری جگہ لکھا:

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو امام المحققین خطاب دیا ہے، گویا محققین نے آپ [یعنی مولوی امام بخش] کو اپنا امام مان لیا ہے...... اگر حضرت [رحیم بیگ] بفتحہ قاف ثانی بصیغۂ تثنیہ امام المحققین کہتے تو ایک ماموم [پیرو] آپ اور نراین داس تنبولی دوسرا ہوتا......"[2]

"...... غالب کا مقصود یہ دکھانا ہے کہ امام بخش صہبائی سب محققوں کے امام تو نہیں ہو سکتے، دو محققوں کے امام ہو سکتے ہیں، ایک رحیم بیگ کے، دوسرے نراین داس تنبولی کے، صہبائی اس زمانہ میں زندہ نہ تھے، ورنہ ان فقروں کا مزہ لیتے....."[3]

لیکن اس میں مطلق کلام کی گنجایش نہیں کہ صہبائی نہ صرف اپنے دور کے اعلیٰ پایے کے عالم تھے بلکہ آج بھی ان کے ہم پلہ ان کے اہلِ وطن میں بہت نہیں، مولانا صہبائی فارسی نثر میں بھی ایک مخصوص اسلوب رکھتے تھے، انھوں نے گلشن بے خار کی ایک طویل تقریظ لکھی، اس میں سے صرف ایک دو جملے نقل کیے جاتے ہیں:

"...... ستودا بحصولِ شہرت طفیلے گیاہ و مزارِ زمانے ست، اصد قصیدۂ شکر مصنفش زیب بیان

(بقیہ ص ۱۳۵) شیخ سعدی [۱۱۸۴ - ۱۲۹۱ء] نے اسی کے رد میں لکھا:

چہ حاجت کہ نہ کرسیِ آسماں — نہی زیر پائے قزل ارسلاں

(بوستان، نولکشور، لکھنؤ ۱۹۶۳ء، ص ۱۹)

[1] گلشن بے خار بحوالۂ بالا ص ۸ - ۲۵۷۔

---

[1] خطوط غالب: مولانا غلام رسول صاحب مہر لاہور، بارِ دوم ص ۵۳۵ [2] ایضاً: ص ۶۲۰ [بنام مرزا رحیم بیگ ساحر] [3] داستان تاریخ اردو: جناب مولانا حامد حسن صاحب قادری، آگرہ ۱۹۵۶ء ص ۹ - ۲۰۸۔

و میر تقی را بتحصیل آزادۂ انواعے لوح مرقد جلد کتابے متضمن عبارات سپاس آرائی نگارندۂ این نسخہ ......[1]

شیفتہ نے گلشن بے خار میں آزردہ کے حال میں ان کے اشعار کے متعلق کوئی تنقیدی بات نہیں لکھی، البتہ ان کے علم و فضل کو حد درجہ سراہا ہے، بعض جملے یہ ہیں[2]:

"آزردہ تخلص افضل الفضلاء، اعلم العلماء، قدوۂ بلغائے ذوی الاحترام، اسوۂ فصحائے عالی مقام، حاوی مناقب جلیلہ بکثرہا و قلہا جامع مناصب جلیلہ باسرہا و جلہا، باعث ظہور فنون عجیبہ، مالک ازمۂ علوم غریبہ، ملک ملکِ بیان و معانی، ..... فرمانروائے قلمرو سخندانی ......"

اس کے بعد دس سطروں میں نہایت فصیح و بلیغ عربی میں ان کے علوم و معارف، ابیاتِ قصیدہ، زباندانی و سخن سنجی کو سرحدِ ادراک سے بھی پرے جا کر سراہا ہے، اور پھر کہتے ہیں[3]:

"......اگرچہ محامد ذکر شریف ایشاں را دریں جریدہ آوردن نشاید اما ایں نامۂ گرامی را بے نام نامیش کہ تا قیام قیامت بر جریدۂ روزگار ثبت باد، در نظر اولوا الابصار تبوے نیابد لاجرم بگذارش نحے از جلائل مآثر ایشاں می پردازد و بدیں بہایوں تذکر رونق ایں صحیفہ افزوں تر می سازد۔"

اس کے بعد آگے چل کر کہتے ہیں کہ:

"..... باعتقاد من روزیکہ بہ شرفِ مجالست ایشاں بپایاں آید، داخل ایام عمر نیست ....."

سبحان اللہ! کوئی صادق الولا مرید باصفا اپنے مرشدِ ولایت آثار کی اس سے بڑھ کر کیا تعریف کر سکتا ہے؟

غالب کے احوال میں شیفتہ نے زیادہ جگر کاوی نہیں کی، پھر بھی لکھتے ہیں[4]:

---

[1] گلشن بے خار، محولۂ بالا، ص ۳ ـ ۲۶۲ [2] گلشن بے خار محولۂ بالا ص ۱۰ [3] ایضاً۔
[4] گلشن بیخار محولۂ بالا ص ۱۳۹۔

"......طوطی بلند پرواز معانی است و بلبل نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی پیش بلندی خیالش اوج فلک پستی زمین است و در جنب تہ نشینی غورش سرفرازی قارون کرسی نشین، شاہین نگہش جز بشکار عنقا پر دانزد و اشہب طبعش جز بعرصۂ فلک نتازد، اگر امروز بتلاش متاع نفیس شتابی جز بدکانش در نیابی ......"

غالب کے احوال میں شیفتہ نے تنقیدی اشارے کیے ہیں، اُن کی عسیر الفہمی، دشوار پسندی کی طرف یہ کہہ کر اچھا اشارہ کیا ہے کہ ان کی فکر کا شاہین عنقا کے شکار کے سوا کسی طرف رغبت ہی نہیں رکھتا، آگے چل کر ان کی غزل کو نظیری کی طرح بے نظیر اور قصیدے کو قصیدۂ عرفی کے مثیل بتایا ہے، ان کی نکتہ رسی اور سخن فہمی و خوش گوئی کی خوب تعریف کی ہے، اور یہ فقرے تو گویا غالب جیسے خود بین و خود آرا شخص کے لیے بھی سند افتخار ہوں گے:

"...... اگر طبع سخن شناس داری بایں نکتہ می رسی چہ خوش فکر اگرچہ کم یاب است اما خوش فہم کمیاب تر خوشحال شخصے کہ از ہر دو مشرب یافتہ و حظے بودہ ......"

نظیر اکبرآبادی کے متعلق شیفتہ نے لکھا[1]:

"..... گویند کہ نظیر در حلم و خلق و انکسار بے نظیر روزگار است، تعلیم صبیان بسر می برد، کم مدت است کہ ازیں خاکدان بروضۂ رضوان رفت، اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقین جاریست و نظر بآن ابیات در اعداد شعراء نشاید شمرد، اما برعایت ابیات منتخب قطع نظر کردہ شد ....."

کہا جا سکتا ہے کہ نظیر کے ساتھ بے شک شیفتہ نے انصاف نہیں کیا، لیکن سوال کیا جا سکتا ہے کہ اور کس نے کیا، سوائے معدودے چند نقادوں کے آج بھی اس کا نام احتیاط کے ساتھ لیتے ہیں اور بیان سے پہلے تمہید باندھتے ہیں۔

---

[1] گلشن بے خار، محولۂ بالا، ص ۲۳۱۔

شیفتہ کا تذکرہ اپنی ان خصوصیات کی بنا پر خاصہ ہنگامہ خیز ثابت ہوا، اور غالب کا اندیشہ اس کے بارے میں بعد کے واقعات کی روشنی میں درست نکلا، یہ تذکرہ جیسا کہ بیان کیا گیا ۱۲۴۸ھ کے اوائل میں شروع ہوا اور ۱۲۵۰ھ کے اواخر میں ختم ہوا، دو نسخے جو عام طور پر رائج ہیں، نول کشور لکھنؤ کے مطبوعہ ہیں، دوسرا نسخہ ماہ اگست ۱۹۱۰ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۲۸ھ کا طبع شدہ ہے، مطبع کی جانب سے اس پر بار دوم لکھا گیا ہے، اس سے قبل کا نسخہ اکتوبر ۱۸۷۴ء مطابق رمضان شریف ۱۲۹۱ھ کا ہے، لیکن اس میں بار اول نہیں لکھا گیا، دونوں نسخوں میں مطبع کی طرف سے خاتمہ کی عبارت ایک ہی ہے اور اس میں کہا گیا ہے کہ تذکرہ گلشن بے خار دار العلم و سلطنت دہلی جس زمانے میں کہ شعرائے نازک اندیشہ، سحر بیان اور فضلائے بلاغت پیشہ سحبان زبان کے اجتماع سے شیراز و اصفہان کے لیے باعث رشک بنا ہوا تھا، مؤلف نے تصنیف کیا تھا اور "دراں عہد بار اول در مطبع انطباع فرمود"

دوسرے نسخے میں بھی یہی عبارت ہے کہ اسی عہد میں کسی مطبع میں شائع کرا دیا تھا اور چونکہ نایاب ہو گیا تھا اس لیے جناب ممدوح روزگار منشی نول کشور نے "بوفور تجسس یکتا نسخۂ پارینہ اش کہ از جابجا وقف کرم دگمس واز فرط پریشانی شیرازۂ اوراقش گسستہ نفس بود" فراہم کر کے شائع کر دیا۔

اس تذکرہ کے کم سے کم دو جواب لکھے گئے جو مطبوعہ صورت میں اب بھی ملتے ہیں، ان میں سے پہلا تذکرہ مولوی نصر اللہ خاں خویشگی کا گلشن ہمیشہ بہار ہے، یہ تذکرہ مولوی نصر اللہ خاں خویشگی نے اپنے دوران ملازمت بجنور میں تحریر کیا، بجنور میں ان کا قیام ۱۲۵۵ھ ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ تک رہا، وہیں انھوں نے شیفتہ کا تذکرہ پڑھا اور اس سے ناخوش ہو کر اپنا تذکرہ لکھنا شروع کیا جو ۱۲۵۸ھ میں مکمل کیا اور ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا، تحریر اور اشاعت میں تیرہ سال کا فصل ہے[۱]، چونکہ مولوی نصر اللہ خاں خویشگی نے بجنور میں تذکرہ شیفتہ کے مطالعہ کا ذکر کیا ہے اس سے

۱؎ گلشن ہمیشہ بہار: پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۳۸۔

قیاس ہوتا ہے کہ کم سے کم ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء سے پہلے کسی تاریخ میں گلشن بے خار شائع اور عام ہو چکا تھا۔

لیکن یہیں گلشن بے خار کا جو مطبوعہ نسخہ ملتا ہے وہ ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء کا چھپا ہوا ہے، اس کا سرورق اس طرح پر مرتب کیا گیا ہے:

گلشن بے خار

تذکرۂ اشعار زبان اردو

من مؤلفات

نواب مصطفیٰ خاں بہادر متخلص بہ شیفتہ، خلف الصدق عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ، مرتبۂ دوئیم۔

در مطبع

دہلی اردو اخبار پریس مکان مولوی محمد باقر گذر اعتقاد خاں میں متصل پنجہ شریف باہتمام پنڈت موتی لعل پرنٹر اور پبلشر کے چھاپا ہوا۔

۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء — الراقم کنور سین

یہ نسخہ نہایت عمدہ نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے، متن کی عبارت میں بالعموم فرق نہیں لیکن حواشی پر بعض فوائد درج ہیں، جن سے کچھ نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن اس نسخہ پر یہ نہیں لکھا کہ کون سی اشاعت ہے، صرف سال اشاعت درج ہے، مولوی نصر اللہ خاں خویشگی "۱۸۴۲ء میں بجنور سے مظفر نگر تبدیل ہو گئے[۱]" تذکرۂ بالا نسخہ دہلی اردو پریس کا ۱۸۴۳ء کا مطبوعہ ہے، اس لیے یہ تذکرہ خویشگی کے پیش نظر نہیں ہوگا۔

۱؎ گلشن ہمیشہ بہار، محولۂ بالا، ص ۳۴۔

جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملک ہے، ڈاکٹر علوی صاحب نے بھی حوالہ میں اسے طبع دوم ہی لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں نسخے جو ۱۸۳۷ء اور ۱۸۴۳ء میں شایع ہوئے ہیں بیک وقت دوسری اشاعت قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اب اس التباس کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے۔ سب سے پہلے اسپرنگر اور اور پھر ایڈورڈز کو کیوں یہ اشتباہ ہوا، جیسا ہم نے عرض کیا اسپرنگر کا نسخہ ہمارے پیش نظر نہیں اس لیے کچھ کہنے سے قاصر ہیں، لیکن ایڈورڈز نے جس نسخے کا اندراج کیا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے، اور اس پر کہیں طبع دوم نہیں لکھا ہوا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہمارا قیاس غلط ہو، لیکن ہمیں اس کی وجہ بڑی دلچسپ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے اور ایڈورڈز کے پیش نظر نسخہ پر شیفتہ کا نام اس طرح درج ہے:

"نواب مصطفیٰ خان بہادر متخلص بہ شیفتہ خلف الصدق عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ، مرتبۂ دویم"

خیال ہے کہ اسی طرح کا اندراج پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مطبوعہ نسخہ میں بھی ہوگا، مظفر جنگ کے بعد مرتبہ دویم سے ہم نے یہ سمجھا ہے جو ہو سکتا ہے کہ غلط ہو، کہ یہ اس خطاب اور منصب کا مرتبہ ظاہر کرتا ہے، یعنی دوسرے درجہ کا خطاب و منصب، اور اس مرتبۂ دویم کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کتاب کی دوسری اشاعت ہے، جیسا کہ ایڈورڈز نے اور اس سے پہلے اسپرنگر نے سمجھا۔ ورنہ ۱۸۳۷ء بمطابق ۱۲۵۳ھ سے پہلے کی کوئی اشاعت گلشن بے خار کی ثابت ہونی چاہیے، جس کی بنا پر ۱۸۳۷ء کو دوسری اشاعت قرار دیا جائے، اگر پھر ۱۸۴۳ء کی اشاعت کو طبع دوم کہنے کا کیا جواز ہوگا؟

بہر حال یہ بات دلچسپ ہے اور اس کی وضاحت ضروری تھی۔

ہمارے پیش نظر گلشن بے خار کا ایک مخطوطہ بھی ہے۔ یہ مخطوطہ اس اعتبار سے دلچسپ اور یادگار ہے کہ یہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کی ملک رہ چکا ہے۔ اب یہ برٹش میوزیم کی ملک ہے، جو

اسپرنگر کی فہرست مخطوطات[1] میں گلشن بے خار کی ایک اور اشاعت کا ذکر ملتا ہے، اس میں گلشن بے خار کی تفصیلات کے تحت یہ معلومات درج ہیں:

"Lithographed at Dilly, Second edition in 1253. A.D. 1837 8 Vo 383 pp."

اس کا مطلب یہ ہے کہ گلشن بے خار دہلی سے ۱۸۳۷ء بمطابق ۱۲۵۳ھ میں شایع ہو چکا تھا، یہ نسخہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکا، اس لیے اس کے متعلق سوائے اسپرنگر کے اندراج کے ہم مزید معلومات پر قادر نہیں۔ یہ نسخہ ہمارے محولۂ بالا نسخہ سے جس کا سرورق ہم نے نقل کیا یقینی طور پر مختلف ہے، سال اشاعت الگ ہے اور ہمارے محولہ نسخہ میں ۴۰۱ صفحات ہیں، اسپرنگر کے محولہ نسخہ میں ۳۸۳ صفحات ہیں، لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ اسپرنگر نے اس نسخہ کو بھی دوسری اشاعت قرار دیا ہے، جیسا کہ محولۂ بالا اقتباس میں درج ہے، اور یہ ۱۸۳۷ء بمطابق ۱۲۵۳ھ کی اشاعت ہے۔

۱۸۴۳ء بمطابق ۱۲۵۹ھ کے نسخے کو جس کا سرورق ہم نے نقل کیا، ایڈورڈ ایڈورڈز نے دوسری اشاعت قرار دیا ہے، اس کا حوالہ یہ ہے[2]:

[Notices of Rekhta poets: with Specimens of their works. Second edition pp. 401. Lithographed Delhi 1843] گلشن بے خار

جناب ڈاکٹر تنویر احمد صاحب علوی نے بھی اپنی تحقیقی کتاب ذوق[3] میں اسی نسخے کا حوالہ دیا ہے،

۱۔ اسپرنگر، فہرست کتب خانۂ اودھ، ج ۱، کلکتہ ۱۸۵۴ء، یہ فہرست بہت مشہور ہے اس لیے اس کا مکمل نام نہیں دیا۔ ۱۲ ۲۔ فہرست مطبوعہ کتب فارسی برٹش میوزیم ۱۹۲۲ء، ص ۵۰۸۔ ۳۔ ذوق: جناب تنویر احمد صاحب علوی، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء، فہرست ماخذات۔

۲۲ر اپریل ۱۸۶۹ء کو پیرس کے ایک کتب فروش سے میوزیم خریدا تھا، اس میں دو سو دس [۲۱۰] ورق [فولیو] ہیں، نہایت عمدہ نستعلیق لکھائی ہے، فولیو شمار ۱ کی نقل اس طور پر ہے :

تذکرۂ گلشنِ بیخار

نواب مصطفیٰ خاں کا

یا فتاح

رب یسر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تمم بالخیر

آخر میں کاتب کا نام درج نہیں، سنہ ۱۲۵۲ھ میں تمام ہوا۔

اس مخطوطہ کے سرورق کی عبارت اس سے زیادہ نہیں، اس لیے شیفتہ کے والد نواب مرتضیٰ خاں بہادر کے القاب اور ان کے مراتب کا بھی ذکر نہیں، مطبوعہ نسخوں میں بھی صرف ۱۸۴۳ء اور ۱۸۳۷ء کے نسخوں میں یہ تمام عبارت درج ہوگی، ورنہ مروجہ نولکشوری اشاعتوں میں اس کا بھی ذکر نہیں۔

تذکرۂ گلشن بے خار خود شیفتہ کی حیات میں دو بار شایع ہوا، اور جب تیسری بار منشی نول کشور نے ۱۸۷۴ء میں شایع کرنا چاہا تو بڑی مشکل سے انھیں ایک نسخہ مل سکا، کتاب کی مقبولیت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ فارسی میں لکھی ہوئی کتاب شاعروں کا احوال، پھر سب لوگ اس سے خوش بھی نہ ہو سکے، اس کے باوجود دوبار مصنف کے سامنے ہی شایع ہو جائے۔

تذکرۂ گلشن بے خار میں اسپرنگر کے قول کے مطابق تقریباً چھ سو شعراء[1]، فہرست مخطوطات بانکی پور کے نزدیک آٹھ سو شعراء[2] اور جناب پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی کے بقول چھ سو چوالیس [۶۴۴] شعراء[3] کا ذکر ہے، ہو سکتا ہے کہ

[1] اسپرنگر، محولۂ بالا، ص ۱۸۹۔ [2] بانکی پور فہرست مخطوطات، ج ۸، عدد ۱۸، ص ۱۵۸، حوالہ ماخوذ از شعرائے اردو کے تذکرے، مصنفہ جناب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۵۲۔ [3] گلشن ہمیشہ بہار، محولۂ بالا، ص ۲۸۔

غلط ہو، لیکن ہمارے حساب سے چھ سو اکہتر [۶۷۱] شاعروں کا حال درج ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے "یہ تذکرہ بہت زیادہ حد تک مجموعۂ نغز مصنفہ قدرت اللہ قاسم سے ماخوذ ہے، اسپرنگر نے حکیم قطب الدین باطن کے تذکرہ نغمۂ عندلیب المعروف بہ گلستانِ بے خزاں کے متعلق بھی کہا ہے[1] کہ اس تذکرہ کو سابقہ یعنی تذکرۂ گلشن بے خار کا ناقابل فہم ہندوستانی میں ترجمہ سمجھنا چاہیے ....."

یہاں پر چند کلمات مغربی علمائے ادب اور بالخصوص مستشرقین کے متعلق کہنے بے محل نہ ہوں گے، اب تک ہمارے یہاں یہ ہوتا رہا ہے کہ اہل مغرب اور بالخصوص انگریزوں نے [ف : ڈاکٹر اسپرنگر جرمن تھا] جو کچھ مشرق، مشرقی ادب، اسلام اور اسلامیات کے متعلق لکھ دیا وہ گویا حرف آخر ہے؛ اور ان کی آرا، و افکار، و اقوال کو بغیر کسی تنقیح کے وحی آسمانی کی طرح التقاط کیا جاتا رہا ہے، اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مغربی محققین نے بڑی جانکاہی اور دیدہ ریزی سے بعض امور کے متعلق بڑی قابل قدر تحریریں مرتب کی ہیں اور ان کی خدمات کو نہ کسی طرح فراموش کیا جا سکتا ہے نہ اس سے روگردانی یا اس کی تحقیر مقصود ہے، لیکن اس میں بھی شبہہ کی گنجایش نہیں کہ صدہا امور کے متعلق ان کی رائے پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی اور اکثر اوقات تحقیق کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یا تو سرے سے بے بنیاد ہے، یا کسی غلط فہمی [اور یہ لفظ اپنے اصل معنی میں سمجھنا چاہیے] کی بنا پر قائم ہے، یا عمداً تحریف کی گئی ہے اور اس معاملہ میں شاذ و نادر ہی کسی کا استثنا ہو تو ہو ورنہ نولدکی، زوتیر، گیبس، نکلسن، براؤن، مونٹگمری واٹ، استھ، اسپرنگر، زیہنر اور دوسرے تمام قابل ذکر قدیم و جدید مستشرقین اس میں شامل ہیں اس وقت سب کی یا صرف چند کی مثالیں بھی پیش کرنا طول عمل اور طول امل دونوں ثابت ہوگا، صرف موضوعِ زیر بحث کو ہی لیتے ہیں، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسپرنگر نے، یا اور جن

[1] اسپرنگر، محولۂ بالا، ص ۱۸۹۔

مستشرقین نے فہرست کتب و مخطوطات مرتب کی ہیں اور ان کے مندرجات کے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ سب ان کتب کے تفصیلی، غائر اور تنقیدی مطالعے پر مبنی ہیں۔

ان کی رائیں اور تبصرے دو قسم کے ہیں، ایک تاریخی امور سے متعلق، دوسرے نقد ادب و شعر کے بارے میں، جہاں تک تاریخی تحقیق کا تعلق ہے وہاں بیشتر ان حضرات کی رائے اور تحقیق درست ہوتی ہے اور نہایت قابل اعتماد، سوائے بعض خاص امور کے، اور وہ بھی بعض مخصوص حضرات کی رائے، جو ان کے جانبدارانہ رویہ پر عمداً مبنی ہوتی ہے، مثلاً بعض تاریخ اسلام کے واقعات یا صوفیائے کرام کے احوال و مکاشفات کی تعبیرات میں بعض مستشرقین نے بڑی تدلیس و تلبیس سے کام لیا ہے، اصل میں تاریخ ان کا دلپسند موضوع ہے، اور اس کی تحقیق و تنقیح کا انھیں ملکہ ہے، رہا نقد شعر و ادب، تو سخن فہمی عالم بالا معلوم شد، اور ایک طرح یہ زیادتی بھی ہوگی کہ ایک اہل مغرب سے جو جرمن، فرنچ، ڈچ یا انگریز وغیرہ ہے ہم یہ توقع کریں کہ وہ اردو فارسی یا عربی کی نظم و نثر پر اسی طرح حاوی ہوگا، جیسی توقع ایک اہل زبان اہل علم سے ہوتی ہے، اہل مشرق بھی جو بزعم خویش اپنے آپ کو انگریز سے زیادہ انگریزی شعر و ادب و تنقید کا عالم و ماہر سمجھتے ہیں مضحکہ خیز غلطیاں کرتے ہیں، اس لیے جہاں شعر و ادب کے متعلق، شاعر کے مرتبے اور اس کے کلام کے درجے کے تعین کا سوال ہے مغربی ماہرین اردو و فارسی کی رائے کچھ بہت زیادہ وقیع نہیں، الا ماشاء اللہ۔

متعدد مبسوط و ضخیم مخطوطوں کا کما حقہ پڑھنا بھی کوئی آسان کام نہیں، اہل زبان کا بھی اس سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے چہ جائیکہ کسی مغربی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ حرفاً حرفاً اسے پڑھ کر اس سے قرار واقعی طور پر استخراج و استنباط کر سکے گا، مثال کے طور پر اسپرنگر کی رائیں ہی پرکھی جا سکتی ہیں، جن کا اس وقت پورا موقع نہیں، لیکن یہ واضح ہے کہ اسپرنگر نے یہ تذکرے بالاستیعاب نہیں پڑھے، اور سرسری ورق گردانی کر کے ایک کو دوسرے سے ماخوذ قرار دیا ہے، مثلاً اس کی یہ دونوں رائیں جو اوپر نقل ہوئیں غلط ہیں: تذکرۂ باطن کا تذکرۂ شیفتہ

کے ترجمہ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور جس زبان کو اسپرنگر نے ناقابل فہم ہندوستانی قرار دیا ہے وہ اکثر جگہ نہایت پُر لطف طنز و تشنیع سے بھرپور ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ اشارے اور یہ زبان کسی المانوی الاصل ڈاکٹر کی سمجھ میں آنی مشکل ہے۔

اسی طرح تذکرۂ شیفتہ کا تذکرۂ قاسم سے ماخوذ ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، اسپرنگر نے قاسم کا حال ہی شیفتہ کے ہاں نہیں دیکھا، جس میں شیفتہ نے صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ

"...... تذکرہ در حال فکر ریختہ نگاشتہ است و بملاحظہ نرسیدہ ......" [۱]

خوشگی کا تذکرہ شیفتہ کی زندگی میں ہی شایع ہو گیا تھا، شیفتہ کی وفات ۱۲۸۶ھ بمطابق ۱۸۶۹ء میں ہوئی، قیاس ہے کہ انھوں نے مولوی نصر اللہ صاحب کے چبھتے ہوئے فقروں سے لطف بھی اٹھایا ہوگا۔

یہاں مولوی نصر اللہ خاں خویشگی کے تذکرے کا تفصیلی ذکر مقصود نہیں۔ جناب ڈاکٹر پروفیسر اسلم فرخی صاحب نے اسے عالمانہ طور پر مرتب کر کے شایع کر دیا ہے، بعض اعتبارات سے یہ اہم اور قابل مطالعہ تذکرہ ہے۔

(باقی)

---

[۱] گلشن بیخار، محولہ بالا، ص ۱۵۷۔

کلاسیکی عربی میں فارسی عنصر

از

ڈاکٹر محمد سلیم اختر، دی آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی، کینبرا، آسٹریلیا

عباسی دور کے معروف اہل قلم اصمعی، کسائی، معمر بن مثنی، خلیل بن احمد اور ابن درید وغیرہ کے آثار میں عربی زبان میں فارسی الاصل الفاظ کی موجودگی کی جانب جستہ جستہ اشارے ملتے ہیں، لیکن اس موضوع پر پہلی مستقل کتاب 'المعرب من الکلام الاعجمی' کی ترتیب کا سہرا چھٹی صدی ہجری کے مشہور مصنف ابو منصور موہوب بن احمد بن محمد بن الخضر الاہوازی معروف بہ جوالیقی کے سر ہے، ان کے بعد گیارہویں صدی ہجری میں شہاب الدین احمد خفاجی کوفی نے شفاء الغلیل مرتب کی جو اپنے محتویات کے اعتبار سے اول الذکر کتاب کے درجہ سے آگے نہ بڑھ سکی، موجودہ دور میں بیسویں صدی کے آغاز میں 'الالفاظ الفارسیۃ المعربۃ' تالیف ادی شیر بیروت سے چھپی اور پھر اس سلسلہ کی چوتھی اہم کڑی اور فارسی زبان میں پہلی کتاب ۱۹۶۸ء میں تہران سے سید محمد علی امام شوستری نے فرہنگ واژہ ہائے فارسی در زبان عربی کے نام سے شایع کی۔

اس موضوع پر کام کرنے والے مستشرقین میں ڈوزی کی تحقیقات سر فہرست ہیں، اور اس سلسلہ میں جو مقالات اب تک چھپے ہیں ان میں احمد تیمور پاشا مصری کی مجلۂ 'المجمع العلمی' دمشق (۱۹۳۲ء) میں 'الالفاظ العباسیۃ' اور دکتر مہدی محقق کی مجلۂ دانشکدۂ ادبیات تہران میں 'تاثیر زبان فارسی در عربی' کے عنوان سے تحریریں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

دکتر مہدی محقق (متولد ۱۹۲۹ء) اسلامی عقلی علوم اور عربی و فارسی زبان و ادبیات میں یکساں دستگاہ کے مالک ہیں، وہ انگلستان اور کینیڈا کی بعض ممتاز یونیورسٹیوں میں پڑھانے کے علاوہ دانشگاہ تہران میں ایک عرصہ سے فارسی زبان و ادب کے استاد ہیں اور صدر شعبہ کی ذمہ داریاں بھی انجام دے رہے ہیں ان کی مرتب کردہ کتب اور ذاتی تالیفات میں اشتر نامۂ عطار، پانزدہ قصیدۂ ناصر خسرو، لسان التنزیل، وجوہ قرآن حبیش تفلیسی، السیرۃ الفلسفیہ رازی، تحلیل اشعار ناصر خسرو اور فیلسوف ری شامل ہیں، اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ایران میں بادشاہت کی تاسیس کی پچیس سویں (۲۵۰۰) سالگرہ کی تقریبات کی مناسبت سے جب بعض چیدہ چیدہ دانشوروں سے اپنی اپنی پسند کے موضوعات پر مقالات لکھنے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے The Problem of Persian Elements in Classical Arabik کا موضوع منتخب کیا، چونکہ اس سلسلہ میں شایع ہونے والے سبھی مقالات الگ الگ کتابچوں کی صورت میں چھپے اور بالعموم اعزازی طور پر ہی تقسیم ہوئے ان کے نسخے ایک خاص حلقے سے باہر نہ نکل سکے اور نہ ایران کے کتب خانوں سے باہر یا عام قارئین تک ان کی رسائی ممکن ہو سکی، دکتر محقق کے مذکورۃ الصدر مقالے سے جہاں موضوع کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے اور اس پر مزید تحقیق کے لیے نئے ابعاد کا سراغ ملتا ہے' وہاں مصنف کی علمی ثقاہت اور وسعت مطالعہ کا کرشمہ بھی قدم قدم پر قاری کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہوا نظر آتا ہے، اس مختصر تمہید کے بعد مناسب ہوگا کہ قارئین اب باقی روئیداد خود مصنف کی زبان سے سنیں: (م. س. ا)

"اس مقالہ کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ فارسی زبان تاریخی اعتبار سے ہمیشہ اور مختلف پیرایوں میں عربی زبان پر اثر انداز رہی ہے، زمانۂ قبل اسلام میں اعراب نے ایران کے ساتھ اپنے روابط کی بدولت فارسی الفاظ و تراکیب اور روایات کو اپنی زبان میں سمویا، اعشی ابن قیس جس نے ایرانی دربار دیکھا تھا' اپنی شاعری میں بہت سے فارسی الفاظ اور محاورات استعمال کرتا ہے' اس کے ایک قصیدے میں بہت سے پھولوں کے فارسی نام مثلاً بنفسج (فارسی: بنفشہ) سوسن، شاہسفرم (فارسی شہسپرم) اور یاسمین

ملتے ہیں۔[1] ایک اور قصیدے میں وہ آلات موسیقی کا ذکر کرتا ہے، جن میں صنج (فارسی: چنگ) بھی شامل ہے۔[2] چونکہ عربی شاعری میں سب سے پہلے یہ لفظ اسی کے یہاں ملتا ہے اس لیے بعض لوگ اسے صناجۃ العرب کے لقب سے یاد کرنے لگے۔[3]

ساسانی سلطنت کے سرحدی علاقوں مثلاً حیرہ وغیرہ میں اعراب کے درمیان فارسی قصوں اور روایات میں دلچسپی فطری بات تھی۔ نضر ابن حارث کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ قرآن مجید سے ہٹانے کے لیے، رستم و اسفندیار اور اسی قسم کی دوسری کہانیاں بیان کیا کرتا تھا۔[4] چنانچہ اس کی مذمت میں قرآن کریم کی درج ذیل آیۂ کریمہ نازل ہوئی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ
وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ[5]

بعض عرب فارسی نام اور القاب بھی استعمال کرتے تھے، مثلاً نعمان بن منذر کا لقب ابو قابوس (فارسی: کاووس) تھا،[6] اور لقیط بن زرارہ کی بیٹی دَختنوس (فارسی: دختنوش) کے لقب سے معروف تھی۔[7]

قرآن میں بھی فارسی الفاظ مثلاً اِسْتَبْرَق[8] (فارسی: استبرک) اور اِبْرِیق[9] (فارسی: آبریز) استعمال ہوئے ہیں، چونکہ قرآن کریم واضح طور پر کہتا ہے کہ وہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس قسم کے الفاظ

[1] الصبح المنیر فی شعر ابی بصیر، لندن ۱۹۲۸ء، ص ۲۰۱ [2] ایضاً ص ۲۴۸ [3] ابن قتیبہ الشعر والشعراء، بیروت ۱۹۶۴ء، ص ۱۶۹ [4] ابن ہشام، سیرۃ النبی، قاہرہ ۱۹۳۶ء، جلد ۱، ص ۳۲۱

[5] لقمان: ۳۱، ۶۔ نیز دیکھئے زمخشری، الکشاف، قاہرہ ۱۹۴۸ء، ج ۲، ص ۵۱۴

[6] الجوالیقی، المعرب، قاہرہ ۱۳۶۱ھ ص ۲۵۹ [7] ایضاً ص ۱۴۲ [8] الکہف: ۱۸، ۳۱، [9] الواقعہ: ۵۶، ۱۸۔

بعد میں علماء کے درمیان بحث وتمحیص کا موضوع بنے رہے۔[1] سیوطی نے اپنی ایک کتاب میں قرآن میں استعمال ہونے والے فارسی الفاظ کو جمع کیا ہے۔[2] مستشرقین میں سے اس موضوع پر کام کرنے والوں میں سے آرتھر جفری بالخصوص قابل ذکر ہیں۔[3]

قرآن کریم کی ایک آیت[4] میں تنزیل پر جملہ بیرونی اثرات کی تردید کی گئی ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آیۂ کریمہ دوسروں کے علاوہ حضرت سلمان فارسیؓ کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین صحابہ میں سے تھے اور جن کی بابت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مشہور ہے کہ علم اگر بنات النعش میں بھی ہوتا تو بعض ایرانی اس تک بھی پہونچ جاتے۔[5] بعض ایسے موارد بھی موجود ہیں جن میں حضرت سلمان فارسیؓ نے فارسی محاورات سے استفادہ کیا ہے۔[6] تاہم آپ کے اثر کی اس سے بھی واضح مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ بعض ایرانیوں کی درخواست پر آپ نے سورۂ فاتحہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کرکے ان کو بھیجا، تاکہ وہ نماز میں اسے پڑھ سکیں۔[7]

کتبِ احادیث میں بھی بعض ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں آنحضرت صلعم نے فارسی الفاظ استعمال کیے ہیں، حضرت جابرؓ سے مروی ایک حدیث میں فارسی لفظ سور اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہونے والی ایک حدیث میں فارسی ترکیب اشکنب درد (شکم درد) ملتے ہیں۔[8]

[1] السیوطی، المزہر، دار الاحیاء الکتب العربیۃ، قاہرہ ص ۲۶۶ [2] السیوطی، المتوکلی، دمشق ۱۳۴۸ھ، ص ۷۔

[3] Arthur Jeffery. The Foreign Vocabulary of The Qur'an - (Barode: Oriental Institute, 1938)

[4] النحل: ۱۶، ۱۰۳۔

[5] الزمخشری ج ۲، ص ۲۱۸ [6] ابن خلدون، مقدمہ، قاہرہ ۱۹۶۰ء ج ۴، ص ۱۲۴۹، ابن عبد البر، الاستیعاب، مطبعۃ نہضت مصر ج ۲، ص ۶۳۶ [7] سید المرتضیٰ، الشافی، تہران چاپ سنگی، ص ۲۱۲ [8] السرخسی، المبسوط قاہرہ، ۱۳۲۴ھ ج ۱، ص ۳۷، [9] ابن الحیان الاصبہانی، اخلاق النبی، قاہرہ ۱۹۵۹ء، ص ۲۷۵۔

فتح ایران کے بعد جب ایران و عرب کے روابط بڑھے اور آمد و رفت میں اضافہ ہوا تو فارسی زبان کے اثرات اور بھی ظاہر ہونے لگے، بعض ایرانی خاندان عرب علاقوں کو نقل مکان کر گئے، عربوں اور ایرانیوں کے درمیان شادیاں ہونے لگیں جن میں مرد بالعموم عرب ہوتا اور عورت ایرانی، اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہ ایرانی خواتین کم از کم ایک نسل تک تو ضرور اپنی زبان بولتی ہوں گی، ان کے بچوں کا اپنی مادری زبان سے متاثر ہونا بدیہی امر تھا، عرب شاعر ابن مقادہ اپنی ایک ایرانی کنیز سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

اگر تو عربی زبان میں تکلم کرے تو کتنی بھلی لگے[1]

اس ضمن میں ظہور اسلام کے بعد عربوں نے ایرانی القابات کے استعمال کا جو سلسلہ شروع کیا وہ بھی قابل توجہ ہے، مثلاً ابن قتیبہ مشہور شاعر جریر کے ایک معاصر علی بن خلیل کا ذکر اس کے فارسی لقب بروخت سے کرتا ہے[2] جو فارسی لفظ پرداختہ کی معرب صورت ہے، اسی طرح یزید بن یزید بھی اپنے فارسی لقب رشک سے معروف تھا[3]

دنیائے عرب کے مختلف حصوں میں فارسی الفاظ کا رواج ظہور اسلام کی ابتدائی چند صدیوں ہی میں ہو گیا تھا، جاحظ کے بیان کے مطابق اہل مدینہ خربوز (پھل)، اور رُزدق (فارسی: رودہ، انتیں) کے الفاظ استعمال کرتے تھے، اہل کوفہ چوراہے کو چہار سو (فارسی: چہار سو) کہتے اور منڈی کو وزار (فارسی: بازار) کے نام سے یاد کرتے تھے[4]، اسی طرح بصرہ کے نواح میں ظرف مکان بنانے کا مشہور فارسی لاحقہ "آن" بھی بکثرت استعمال ہوتا تھا جس کی مثالیں محلّبان، طلحتان اور خیارمان ایسے الفاظ میں ملتی ہیں[5]، ایران کے جنوب میں موجودہ شہر آبادان کا نام اسی قاعدے کی رو سے

---

[1] ابو الفرج الاصفہانی، الاغانی ج ۲، ص ۱۱۲ [2] ابن قتیبہ ص ۶۰۰ [3] السمعانی، الانساب لندن ۱۹۱۲ء ورق ۲۵۲ ([4] جاحظ البیان والتبیین، قاہرہ ۱۹۳۲ء ج ۱، ص ۲۳ - ۳۲ [5] یاقوت، معجم البلدان ج ۱، ص ۶۴۵.

عبادان تھا[1]، جاحظ اپنی کتاب البخلاء میں بہت سی اغذیہ اور مشروبات کے فارسی ناموں کا ذکر کرتا ہے[2]، مثلاً جوارش (فارسی: گوارش، ہاضمے کے لیے مفید غذا) شبارق (ایک قسم کی مٹھائی جو فارسی میں پشپارہ کہلاتی ہے) اور فالوذج (فارسی: پالودہ، ایک قسم کا شیریں مشروب)، اسی طرح تجارہ نامی اپنی کتاب میں وہ بہت سی اشیائے خرید و فروخت کا ذکر کرتا ہے جن میں الفیروزج الشیربام الآسمانجونی (فارسی: فیروزۂ شیر فام آسمانگونی) بھی شامل ہے[3]

صولی کے بیان کردہ اس واقعے سے بھی عرب علاقوں میں فارسی الفاظ کے رواج کا پتہ چلتا ہے، ایک دفعہ ایک ایرانی اور ایک عرب ایک دوسرے کے ساتھ بحث کر رہے تھے، دوران گفتگو ایرانی نے عرب سے کہا: ہم کسی بھی معاملہ میں تمہارے دست نگر نہیں جب کہ تمہیں قدم قدم پر ہماری ضرورت پڑتی ہے، یہی نہیں بلکہ تم نے اپنی بعض غذاؤں مثلاً اسفیداج، سکباج، اور دوغ باج وغیرہ، مشروبات مثلاً سکنجبین، خلنجبین اور جلاب وغیرہ اور انتظامی اصطلاحات مثلاً روزنامج، اسکودار، اور رقروانک کے نام تک ہم سے حاصل کیے ہیں[4]

فارسی الاصل عرب شعراء نے بھی فارسی الفاظ و محاورات کو عربی زبان میں منتقل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا، بشار بن برد جسے اپنے فارسی الاصل ہونے پر فخر تھا[5]، اور ابو نواس جو قدیم عرب شعراء سے متنفر تھا[6]، دونوں اس ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، موخر الذکر نے تو اپنی بعض منظومات میں پہلوی اور زمانہ ماقبل اسلام کے الفاظ و محاورات سے بھی استفادہ کیا ہے[7]، ان دو کے علاوہ

---

[1] مقدسی، احسن التقاسیم، لیڈن ۱۹۰۶ء، ص ۱۱۴ [2] جاحظ، البخلاء، قاہرہ ۱۹۶۳ء، ص ۳۵، ۲۰۳.
[3] جاحظ، التبصر بالتجارۃ، قاہرہ ۱۹۳۵ء، ص ۱۴ [4] الصولی، ادب الکتاب، قاہرہ ۱۳۴۱ھ، ص ۱۹۳.
[5] جاحظ، البیان، ج ۱، ص ۵۶ [6] ابو نواس، دیوان، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۶۹۱.
[7] ابو نواس، دیوان، مخطوطہ ورق ۲۹، کتابخانۂ مجلس شورائے ملی، تہران، ص ۳۳۲.

دوسرے عرب شعراء کے یہاں بھی کبھی کبھی فارسی الفاظ کا استعمال دکھائی دیتا ہے، مثلاً بحتری نے درفش، بلبذہ اور نموذج[1] اور معری نے شطرنج کی اصطلاحات شاہ، رخ اور بیادق کو اپنے آثار میں جگہ دی ہے۔[2]

فارسی الاصل الفاظ کا استعمال عربی شاعری تک ہی محدود نہیں، اس کے نشانات نثری متون میں بھی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں تین مشہور کتابوں کا ذکر کریں گے، پہلی کتاب عثمان بن منقذ کی الاعتبار ہے[3] جو چھٹی صدی ہجری میں شام میں لکھی گئی، اس میں ہم سرفسار، سرہنگ، خودہ، درکاہ، تخت اور برجم جیسے معربات دیکھتے ہیں، دوسری کتاب ابن الفوطی کی تالیف الحوادث الجامعہ ہے جو آٹھویں صدی ہجری میں عراق میں لکھی گئی، اس میں مصنف نے چرخ، سرپوش، زرکش، کارخانہ، خربندیہ اور زردار قسم کے فارسی الفاظ سے استفادہ کیا ہے، تیسری کتاب آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں مصر میں لکھی گئی، سبکی کی معید النعم ہے، اس میں مہماندار، تیردار، جوکاندار، جمدریہ، امیر شکار اور امیر آخور جیسے الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔

کلاسیکی دور میں فارسی زبان سے عدم واقفیت کے باعث بعض غلط اشتقاقات بھی شہرت و رواج کی سند پا گئے، یاقوت کے بقول جب کسی نے معروف نحوی زجاج سے لفظ قصعۃ کا ماخذ دریافت کیا تو اس نے جواب دیا: لانہ تقصع الجوع، یعنی اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سے بھوک کی تسکین ہوتی ہے، حالانکہ درحقیقت یہ فارسی لفظ کاسہ (پیالہ) ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے، السیوطی کا عقیدہ ہے کہ کسی فارسی

---

[1] بحتری، دیوان، قسطنطنیہ، سنہ ۱۳۰۰ھ، ج ۱، ص ۱۰۹ آخری لفظ کے لیے ملاحظہ ہو چاپ قاہرہ ۱۹۶۳ء ج ۱ ص ۴۰۴

[2] معری، شرح التنویر علی سقط الزند، قاہرہ، مطبعۃ مصطفے محمد ج ۲، ص ۲۱۷۔ [3] پرنسٹن ۱۹۳۰ء ص ۱۳، ۲۶، ۴۶، ۴۹، ۵۲، ۶۲۔ [4] بغداد ۱۳۵۱ھ، ص ۳۶، ۷۷، ۱۹۴، ۴۰۷، ۴۱۹، ۴۳۱۔

[5] قاہرہ ۱۹۲۷ء ص ۳۱، ۳۵ [6] یاقوت ارشاد، قاہرہ، ۱۳۵۵ھ ج ۱، ص ۵۹۔

لفظ کا اشتقاق عربی زبان سے منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ مچھلی پرندے سے پیدا ہوتی ہے[1]

عربی متون کی تصحیح میں مشغول اہل علم کے لیے عربی پر فارسی اثرات آج بھی ایک الجھن بنے ہوئے ہیں، بسا اوقات تو اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیتے ہیں، لیکن کبھی کبھار الفاظ کی غلط توجیہ کرنے لگتے ہیں، مثلاً دیوانِ بشار کے مرتب نے مُقَرطَق کا مفہوم کانوں میں گوشوارے پہننے والا شخص لیا ہے، گویا یہ لفظ قرط سے ماخوذ ہو، جس کے معنی گوشوارہ کے ہیں،[2] جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ 'قرتق' سے بنا ہوا ہے جو پہلوی لفظ کرتک (فارسی: کرتہ) کی معرب صورت ہے۔[3] اسی طرح دیوان ابونواس کے مرتب نے لفظ موزج کے معنی پر[illegible] سمجھ لیے ہیں جب کہ یہ پہلوی لفظ موزک (فارسی: موزہ) کی معرب شکل ہے۔[4] ایسی ہی ایک مثال ثعالبی کی یتیمۃ الدہر کے مرتب کی ہے جس نے لفظ تکسود کے مفہوم سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے،[5] جو کہ معروف فارسی لفظ تکسود (تکیہ) ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔[6]

اسی طرح ابن خلدون کے مقدمہ کی تازہ ترین اشاعت میں زرکش کاویان کی ترکیب استعمال ہوئی ہے،[8] جس کی صحیح صورت 'درفش کاویان' ہے، یعنی معروف دیومالائی ایرانی کردار کاوہ کا جھنڈا۔ ابوالعلا معری کے رسالۃ الغفران کے مرتب نے لفظ لالکا کا مفہوم سمجھنے سے معذوری ظاہر کی ہے،[10] یہ بھی فارسی لفظ ہے جس کے معنی جوتے کے ہیں۔[11]

اس میں شبہہ نہیں کہ جوالیقی، خفاجی[12] اور ادی شیر[13] کے آثار عربی متون میں فارسی الفاظ کی مشکل کے حل میں ہماری مدد کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی جملہ موارد میں دانشمندوں کی ضروریات کی کفالت پر قادر نہیں، اندریں حالات کلاسیکی عربی متون کو اساس بنا کر فارسی الاصل الفاظ و تراکیب کی ایک جامع لغات کی تدوین کے لیے جو اقدام بھی کیا جائے گا وہ بنظر استحسان دیکھا جائے گا اور ایسی کتاب کی موجودگی سے کلاسیکی عربی متون پر کام کرنے والوں کو بہت آسانی ہو جائے گی۔

---

[1] السیوطی، المزہر، ص ۲۸۷ [2] بشار، دیوان، ۱۳۶۹ھ مقدمہ ص ۷ [3] جوالیقی ص ۲۶۵ [4] ابونواس ۱۹۵۵ء ص ۹۴۳

[5] جوالیقی ص ۳۱۰ [6] ثعالبی، یتیمہ، قاہرہ ۱۳۶۶ھ ج ۳، ص ۷۶ [7] Dozy, Suppl'ement Aux Dictionaires Arabes (Paris, 1927), Vol II. P. 276

[8] ابن خلدون ج ۲، ص ۱۱۲۳ [9] البیرونی، الآثار الباقیہ، لیپزگ ۱۹۲۳ء ص ۲۲۲ [10] معری، الغفران، دار المعارف ص ۲۵۰ [11] دوزی ج ۲، ص ۵۰۰ [12] شفاء الغلیل، قاہرہ ۱۳۲۵ھ [13] الالفاظ الفارسیۃ المعربۃ، بیروت ۱۹۰۸ء

وفیات

آصف علی اصغر علی فیضی مرحوم

از

سید شہاب الدین دسنوی

۲۲ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو آصف علی اصغر علی فیضی بمبئی کے بریچ کینڈی اسپتال میں انتقال کر گئے، ان کی وفات سے ایک بلند پایہ دانشور اور محقق اور اچھے مقرر کی جگہ خالی ہوگئی۔

اپنے مزاج کے لحاظ سے فیضی صاحب نہایت خوش اخلاق، ہنس مکھ، وضعدار اور مہذب انسان تھے، ان کے پہلو میں حساس دل تھا جو کبھی اپنی ملت پر نالہ زن ہوتا، اور کبھی انسانیت کی گھٹتی ہوئی قدروں پر سوگوار، قانون؛ بالخصوص مروجہ محمڈن لا پر ان کی گہری نگاہ تھی، وہ بیرسٹر تو تھے، مگر پریکٹس بہت کم کی، ان کا محبوب مشغلہ تنقید اور تحقیق تھا، انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے تھے، ان کے تبصرے اکثر ٹائمس آف انڈیا اور دوسرے موقر انگریزی اخبار اور رسالوں میں شائع ہوتے جو قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔

فیضی صاحب نے بمبئی اور کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، گورنمنٹ لا کالج، بمبئی میں پروفیسر اور پرنسپل کی حیثیت سے کام کیا، بمبئی ریاست، پھر یونین پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے، مصر میں ہندوستان کے سفیر اور کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، پھر ریٹائرڈ ہو کر بمبئی میں مقیم ہوگئے۔

۱۹۳۳ء میں اسماعیل یوسف کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد بذل الرحمن، پروفیسر ڈاکٹر داؤد پوتہ اور

پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ساتھ مل کر فیضی صاحب نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی، مشہور روسی نژاد محقق اور مستشرق پروفیسر ایوانو اور فیضی صاحب نے مل کر اس ادارے کے تحت اسماعیلی اور فاطمی عقائد سے متعلق کئی نادر مخطوطات ایڈٹ کر کے شایع کیے، اس کام کے لیے سابق آغا خاں کی طرف سے ایک معقول رقم بطور گرانٹ ملی تھی، ۱۹۳۲ء میں بمبئی یونیورسٹی کی دعوت پر علامہ سید سلیمان ندوی نے "عربوں کی جہاز رانی" پر جو خطبے دیے تھے انھیں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن نے کتابی صورت میں شایع کیا تھا، اسی ادارے کی دسویں سالگرہ کے جلسہ میں علامہ سید سلیمان نے بمبئی میں ایک خصوصی خطبہ "ادب اور تعمیر ملت" کے عنوان سے دیا تھا۔

فیضی صاحب نے قاضی نعمان کی اہم تصنیف "دعائم الاسلام" کا ایک مستند اور عمدہ ایڈیشن کئی سالوں کی محنت کے بعد تیار کر کے 'دار المعارف' مصر سے شایع کیا، اور انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ بھی کیا، یہ ان کا سب سے بڑا تحقیقی کارنامہ ہے جس پر انھیں بجا طور پر ناز تھا۔

مذہبی امور میں فیضی صاحب کے خیالات، بعض معاملات مثلاً عائلی قوانین کے بارے میں ہمارے علماء کے خیالات سے کچھ حد تک جدا تھے، وہ ان میں زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے ترمیم چاہتے تھے، دراصل وہ اسلام میں جدیدیت کی تحریک دیکھنا چاہتے تھے، جس کا ثبوت ان کی تصنیف A Modern Approach to Islam سے ملتا ہے، مگر فیضی صاحب کو جنھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ یہ جانتے ہیں کہ ہمارے علمائے کرام کے وہ دل سے قدر دان تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے، دار المصنفین اور شبلی اسکول کے محققین کی تعریف کرتے تھے، ایک ہزار روپیہ دے کر وہ دار المصنفین کے لائف ممبر بنے، ۱۹۷۴ء میں جب دار المصنفین کی مجلس منتظمہ کا جلسہ بمبئی میں ہونا طے پایا تو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راقم نے فیضی صاحب کے مشورے سے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے تحت شرکائے جلسہ میں سے بعض کی تقریروں کا انتظام کیا، ناسازی طبع کے باوجود فیضی صاحب ان نشستوں میں شریک ہوئے، جس

احترام سے انھوں نے مولانا عبد الماجد دریابادیؒ، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ، سید صباح الدین عبد الرحمٰن وغیرہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ اس سے خود یہ بزرگ بھی متاثر ہوئے، اپنے مضمون "سفر بمبئی" (صدق جدید) میں مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے اس کا ذکر فرمایا ہے۔

فیضی صاحب کی دو خصوصیات کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے، ایک تو وہ انتہائی اصول پسند واقع ہوئے تھے، اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ یونین سروس کمیشن کی ممبری کے دوران میں ایک مسلمان نوجوان آئی۔ اے۔ ایس کے انٹرویو کے لیے کمیشن کے سامنے پیش ہونے والے تھے، ان کے والد صاحب فیضی صاحب سے تعلقات کی بنیاد پر انٹرویو کی صبح فیضی صاحب کے گھر پہونچے اور باتوں باتوں میں بتا دیا کہ ان کا بیٹا انٹرویو میں جا رہا ہے، فیضی صاحب دفتر جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے، ان صاحب کے چلے جانے کے بعد انھوں نے پہلے دفتر خط لکھ بھیجا کہ ان کے ایک دوست اپنے لڑکے کے انٹرویو کے سلسلہ میں ان سے مل چکے ہیں، اس لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس دن انٹرویو میں وہ کمیشن کے ساتھ شریک ہوں، انھوں نے یہ بھی احتیاط برتی کہ نہ تو امیدوار اور نہ ان کے والد کا نام ظاہر کیا، نتیجہ نکلنے پر لڑکا کامیاب رہا، فیضی صاحب نے مبارکباد لکھ بھیجی۔

دوسری خصوصیت فیضی صاحب کی یہ تھی کہ علمی اور تحقیقی کاموں میں وہ رواداری برتنے کے قائل نہ تھے، تحقیق کے معاملہ میں ان کا مزاج پوری طرح مغربی انداز میں ڈھلا ہوا تھا، الفاظ کی چھان بین، حوالے اسناد معتبر یا غیر معتبر، ہر ایک بات میں حد درجہ احتیاط برتتا، ان کی تنقید نگاری میں اکثر مغربی طرز کا "خشک طنز" پایا جاتا تھا، ایک بار کسی تحقیقی کتاب پر انھوں نے پہلے تو اس کے اغلاط کی نشاندہی کی، پھر لکھا کہ اس کتاب سے ریسرچ کرنے والوں کو البتہ ایک بڑا فائدہ یہ پہونچے گا کہ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ تحقیق کس طرح نہیں کرنی چاہیے۔

فیضی صاحب کتابوں کے قدردان تھے، وہ کتابیں جمع کرنا ہی نہیں بلکہ انھیں سلیقہ اور احتیاط سے رکھنا بھی جانتے تھے، ۱۹۵۷ء میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو اپنی بیشتر مطبوعہ کتابیں اس یونیورسٹی

کے کتب خانے کو دے دیں، اس سے چند سال قبل اپنے ذخیرے سے انھوں نے اسماعیلی مذہب سے متعلق ایک سو چھیاسی[۱۸۶] مخطوطات اور دیگر تینتیس[۳۳] مخطوطات بمبئی یونیورسٹی کی لائبریری کو نذر کر دیے۔ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر ایم. گوریا والا نے ان مخطوطات کی فہرست مرتب کر کے شائع کی، جو چند فقہ سے متعلق مخطوطات ان کے پاس بچ رہے، ان کی فہرست خود فیضی صاحب نے اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شائع کی۔

اردو سے فیضی صاحب کو بڑی محبت تھی، وہ ادیب تو نہ تھے، مگر اپنے علم و دانش کی بدولت جو کچھ لکھتے وہ تحریر خاصی دلچسپ ہوا کرتی تھی، ان کی اہلیہ سلطانہ فیضی (قاضی کبیر الدین کی صاحبزادی) اچھا لکھتی تھیں، ان کی کئی کتابیں عروس نیل، چڑیاں وغیرہ چھپ کر خاصی مقبول ہوئیں۔

بدقسمتی سے فیضی صاحب کا آخری زمانہ بڑی حسرت اور ذہنی کوفت میں گذرا، راقم کی ان سے آخری ملاقات یکم جون کو ہوئی جب وہ اپنے لاعلاج مرض کو صحتیابی کے بجائے موت کی طرف لے جانے کے خواہشمند تھے، اس کے باوجود وہ یورپ کے سفر کی تیاری کر رہے تھے جہاں انھیں ایک انسٹیٹیوٹ آف اسماعیلی اسٹڈیز قائم کرنے کی دعوت موصول ہوئی تھی، وہ لندن پہونچے بھی، مگر جلد ہی صحت سے مجبور ہو کر واپس آ گئے، بمبئی کے مشہور بریچ کینڈی اسپتال میں داخل ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

فیضی صاحب، بدر الدین طیب جی مرحوم کے نواسے تھے، مسلک کے لحاظ سے سلیمانی بوہرہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اور اس جماعت کے اکثر افراد کی طرح وسیع القلب اور بڑے فراخ دل تھے، عام مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرنے میں کبھی عذر نہیں کیا، خود راقم کو فیضی صاحب کے گھر پر کبھی مغرب کی نماز پڑھنے کا موقع ملا تو فیضی صاحب کبھی تو شریک ہوئے اور کبھی یہ کہتے ہوئے معذرت چاہی "میں آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا مگر پیروں میں تکلیف کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھتا ہوں، اس لیے اجازت دیں تو دوسرے کمرے میں پڑھ لوں؟"

ان کے ذخیرے میں کلام پاک کے کئی خوبصورت اور قدیم قلمی نسخے تھے جنھیں وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی کوتاہیوں کو معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

مطبوعات جدیدہ

رجال السند والہند (عربی) مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۰۰، قیمت: درج نہیں، پتہ: دارالانصار، ۲۰ شارع البستان ناصیہ شارع الجھوریۃ عابدین قاہرہ۔

یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو بڑے حذف و اضافہ کے بعد شایع کیا گیا ہے، اور دو جزوں پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی ضخامت بھی دوچند ہوگئی ہے، پہلے جزء میں ہند و سند کے دو طرح کے اشخاص کا تذکرہ ہے، ایک وہ جو یہیں پیدا ہوئے اور مدۃ العمر یہیں رہے، دوسرے وہ جن کا اصل تعلق تو اسی سرزمین سے تھا، مگر ان کی ولادت و سکونت باہر رہی، دوسرے جزء میں باہر سے یہاں آکر واپس چلے جانے والوں یا باہر سے آکر یہیں قیام پذیر ہونے اور یہیں کی خاک کا پیوند ہونے والوں کا تذکرہ ہے۔ دونوں جزوں میں ساتویں صدی سے قبل کے مختلف طبقوں کے سیکڑوں مشاہیر کا ذکر ہے، پہلے جزء کے شروع میں ساتویں صدی سے پہلے کے عالم اسلام بشمول سندو ہند کی مختصر مرقع آرائی کرکے دکھایا ہے کہ علمی، دینی، سیاسی اور تمدنی حیثیت سے یہ مسلمانوں کا عہد زریں تھا، نیز اس دور کے مشہور اور اہم شہروں کے متعلق بھی مختصر معلومات قلمبند کیے ہیں، دوسرے جزء کا آغاز ہندوستان میں آنے والے صحابۂ کرام رض سے کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مصنف کو یہ صراحت کردینی چاہیے تھی کہ اکثر صحابۂ کرام غازی اور فوجی کی حیثیت سے یہاں تشریف لائے تھے، لیکن انھوں نے نہ تو اس کو اپنا مستقر بنایا اور نہ ان کی یہاں وفات ہوئی، دوسرے اس دور میں مکران وغیرہ بھی سندو ہند ہی کا جزء سمجھے جاتے تھے اور اس زمانہ کے اکثر فاتحین وہیں آئے تھے، یہ کتاب رجال و انساب، طبقات و تراجم، تاریخ و جغرافیہ، فتوح و مغازی اور ادب و محاضرات کی بیشمار کتابوں کی ورق گردانی کے بعد لکھی گئی ہے اور اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی تاریخ پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

"ض"

جلد ۱۲۹ ماہ جمادی الاولی ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۲ء عدد ۳

مضامین

مقالات

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب رح نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے جلسہ میں چند پرازمعلومات اور محققانہ خطبے دیے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، ان میں انھوں نے عربی مآخذ کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی فتوحات سے بہت پہلے مسلمان عربوں کی آمد و رفت جنوبی ہندوستان میں شروع ہوچکی تھی، جہاں ان کی نوآبادیاں قائم ہوگئی تھیں جن میں ان کا اپنا دینی نظام دارالقضاء، دارالافتاء وغیرہ تھا، مقامی راجاؤں سے انھوں نے بڑے خوشگوار تعلقات پیدا کرلئے تھے،

طبع دوم عکسی — قیمت :- ۳۰ روپیے

"منیجر"